جلد ۱۳۲ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۳ء عدد ۱

مضامین

شذرات

معارف کے ان صفحات پر برابر ذکر آیا ہو کہ حکومت ہند کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت کرنا اس کی سیاسی مصلحت کوشی اور مآل اندیشی کے لئے بالکل مناسب نہیں،

ادھر اخباروں میں یہ خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ اقلیتی کمیشن کی پیش کردہ تجاویز کی بنا پر حکومت متبنّٰی بل کو مسلمانوں پر بھی نافذ کرنے پر غور کر رہی ہے، حالانکہ دو سال پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ کے احتجاج پر اس کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا، اب اگر اخباروں کی خبر صحیح ثابت ہوئی تو پھر اس سے یا تو مسلمانوں کی دینی غیرت اور حمیت کا امتحان لینا مقصود ہے یا ان کو ذہنی اور فکری انتشار میں مبتلا کرنا ہے، کیونکہ ان پر اس کا نفاذ نصِ قرآنی کے خلاف ہوگا جس سے معلوم نہیں ان میں کتنا اشتعال پیدا ہو، اسلام میں متبنّٰی کی حیثیت حقیقی اولاد کے مساوی نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو منھ بولا بیٹا بنایا تھا، لیکن ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر تسلیم نہیں کی گئی، اسی لئے آپ نے ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا، اگر ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر ہوتی، تو یہ نکاح ہو نہیں سکتا تھا، اس نکاح سے اس قدیم رسم کو بھی توڑنا تھا، جس سے منھ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا،

کلام پاک میں، اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہو کہ "ہم نے تمھارے منھ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منھ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے، اور وہی صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، منھ بولے بیٹوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے، اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں" (الاحزاب آیت ۴-۳)

اگر متبنّٰی بل مسلمانوں پر نافذ کیا گیا، تو ان کا قانون وراثت لازمی طور پر زیر بحث آئے گا، اسلام میں ذاتی ملکیت یا جائداد اسی وقت جائز تسلیم کی جاتی ہے، جب یہ قرآن پاک کے قانونِ وراثت کے ماتحت ہو، اس کا صریح حکم ہے کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہئے، خواہ یہ کم ہو یا بیش، (النساء - ۶) اس میں منقولہ اور غیر منقولہ، زرعی یا غیر زرعی، آبائی اور غیر آبائی کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، متوفی کے پورے مال کی تقسیم لازمی ہے، اس ترکہ میں کون کون وارث ہوتے ہیں، اس کی پوری تفصیل قرآن پاک میں بتا دی گئی ہو جس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کی اجازت کسی کو حاصل نہیں،

کلام پاک میں ہو کہ متوفی پر قرض ہو تو پہلے یہ ادا کیا جائے، یا اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو وہ پوری کی جائے، اس کے بعد اس کی اولاد ہو تو لڑکوں کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو، اگر اس کی صرف لڑکیاں ہوں تو اس کے کل ترکہ کا ⅔ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہو، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے، اولاد رہنے کے باوجود اس کے والدین کو چھٹا حصہ ملنا چاہئے، اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو تو والدین ہی اس کے وارث ہوں گے، اس میں ماں کو تیسرا حصہ دیا جائیگا، اور اگر اس کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حق دار ہوگی، اگر بیوی یا بیویوں نے کچھ چھوڑا ہو اور وہ بے اولاد ہوں، تو اس کا آدھا حصہ شوہر کو ملے گا، اور اگر وہ اولاد رکھتی ہوں، تو ترکہ میں شوہر کا ایک چوتھائی حصہ ہوگا، اور اگر بے اولاد شوہر نے کچھ چھوڑا ہو تو بیویاں اس کے ترکہ میں چوتھائی حصہ کی حقدار ہوں گی، اور اگر وہ صاحبِ اولاد ہو تو بیویوں کا حصہ آٹھواں ہوگا،

اگر کوئی مرد یا عورت بے اولاد ہو اور اس کے ماں باپ بھی نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کی ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے، یہ بھی حکم ہے کہ جب تقسیم کے موقع پر

کنبہ کے لوگ یتیم اور مساکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دیا جائے، (نساء ۱۱-۱۲)
اس میں کہیں ذکر نہیں کہ کوئی لاولد ہو تو وہ کسی کو متبنّٰی بنالے، اور اس کو ترکہ میں وہی شرعی حق دے، جو حقیقی اولاد کو دیا جاتا ہے،

ہاں اگر بعض مقامی رسم و رواج کے مطابق ایک لاولد شخص کسی کو متبنّٰی بنالے تو وہ اپنی زندگی ہی تو اس کو اپنی ملکیت، مال اور جائداد کا ⅓ حصہ دے سکتا ہے یا اپنا پورا ترکہ عصبہ کی اجازت سے اس کو دیدے یا اس کو دینے کے بعد عصبہ اپنے حصوں کے دعویدار نہ ہوں تو متبنّٰی کا قبضہ اس پر ہو سکتا ہے، مگر کسی اسلامی حکومت کو بھی یہ حق نہیں کہ کوئی قانون بنا کر متبنّٰی کو وہی شرعی حق دلائے جو کلام پاک میں حقیقی اولاد کو دیا گیا ہے، کسی قانون کے ذریعہ سے تمام عصبہ کو ان کے حق وراثت سے محروم کرکے متبنّٰی کو سارا ترکہ دلادیا جائے تو یہ انسانی قانون کلام پاک میں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی نفی کرے گا، جو مسلمانوں کے لئے ہرگز قابلِ قبول نہیں،

ابن ماجہ اور ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "وراثت کا علم سیکھو اس لئے کہ وہ نصف علم ہے وہ بھلادیا جائیگا، اور وہ پہلی چیز ہوگی جو میری امت کے سینوں سے کھینچ لیجائیگی"

اگر واقعی اس کو یا ہمارے اور پرسنل لا کو ہماری حکومت نے مسلمانوں کے سینوں سے کھینچ لیا تو یہاں کی سیاسی زندگی میں آسام، پنجاب، اور کشمیر سے کم الجھاؤ نہ پیدا ہوگا، ہماری حکومت کے دردِ سر کے لئے کیا کم مسائل ہیں جو اس کے بعض بظاہر فہیم لیکن دراصل نادان مشیروں کی وجہ سے اس کی پریشانیوں میں کچھ اور اضافہ ہو جائے،

خاکسار راقم ۱۳؍ جولائی ۸۳ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن کے ایک بین الاقوامی سمینار میں شرکت کے لئے وہاں روانہ ہوگا، اس سمینار کا موضوع اسلام میں، اسٹیٹ اور پالٹکس ہے، خدا کرے یہ سفر بخیر و خوبی انجام پاجائے، اس کی روداد معارف میں آئندہ انشاء اللہ شائع ہوگی،

مقالات

اسلام اور مستشرقین

از

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی (جنوبی افریقہ)

(۳)

جیمز، التائم معروف مستشرق منٹگمری واٹ کی رواداری، اور انصاف پسندی کا چرچا خاصہ ہے، ان کی تین معروف تالیفات مغرب اور مشرق دونوں جگہ مقبول ہیں، محمد در مکہ (۱۹۵۳ء) محمد در مدینہ (۱۹۵۶ء) اور محمد من حیث نبی اور اسٹیٹسمین (۱۹۶۱ء) کی دھوم مچی، اور اگر بغور دیکھا جائے تو مولف کے موقف میں روایتی موقف سے زیادہ نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے، یہ تصور موجود ہے کہ محمد مکہ میں کچھ اور تھے، اور مدینہ میں کچھ اور ہو گئے، یہ قدیم موضوع بحث ہے، اس میں نیا پن نہیں، خود ٹوائن بی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے، پروفیسر واٹ نے ان کتب میں آنحضرت ؐ اور اسلام کے منظر و پس منظر کا تحلیلی مطالعہ کیا ہے، جس کے ذریعہ وہ اسلام کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں، اول الذکر دو کتابیں سیرت محمدؐ سے متعلق ہیں، آنحضرت ؐ کے تاریخی اور سوشل پس منظر میں آپکے کارناموں اور زندگی کا تجزیہ ہے، مکہ کے سوشل اور معاشی حالات کی تحلیل ہے، یہ موضوع بھی اچھوتا یا جدید نہ تھا، مولف یورپ کے وحشیانہ حملوں کے خلاف آنحضرت ؐ کا دفاع ضرور کرتا ہے،

اس کے خیال میں محمدؐ کے عظیم کارناموں کی روشنی میں وحشیانہ حملے غیر موزوں ہیں۔

محمدؐ در مدینہ ص ۳۳۵ تیسری کتاب جو اوّل الذکر دو جلدوں کی تلخیص بھی ہے اس لئے قابل توجہ ہے کہ اس میں مولف نے آنحضرتؐ کی نبوت اور اخلاص کو تسلیم کیا ہے، یہ موقف بھی نیا نہ تھا، اس سے پہلے بھی یہ موضوعات زیر بحث آچکے تھے۔ ان کتابوں میں وہ کلام پاک پر حملے برابر کرتے ہیں، وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کا نزول وحی کے ذریعہ سے ہوا۔

برناڈ لوئس امریکہ مستشرق حیی القائم ہے، اور اسلام دشمنی کیلئے معروف بھی ہے جس کی تازہ ترین مثال اس کا وہ مقالہ ہے جو امریکن اسکالر نامی مجلہ شمارہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۳،۳ پر مولف قرآن کریم کا موازنہ جرمنی کے ایک وثنی رزمیہ کے ساتھ کرتے ہیں، وہ رزمیہ جس سے معروف جرمن موسیقار واگنر نے اپنے بعض اوپرا اخذ کیے تھے، اس سے زیادہ مضحکہ خیز اسکالرشپ اور کیا ہو سکتی ہے، یہی اساتذہ امریکی جامعات میں دراسات اسلامیہ کے سربراہ ہیں، دوسری مثال ریڈرز ڈائجسٹ کے اڈیٹر انتھائی پال کی ہے، جس نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی کی ریگستانی اور وحشیانہ دیدہ یا نہ سوسائٹی کے لئے آج سے دس صدی قبل وضع کیا گیا تھا، (ریڈرز ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۰۲) ایک عالمی اور شہرۂ آفاق پرچہ کے اڈیٹر کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلام کی چودہ[۱۴] صدیاں مکمل ہو چکی ہیں، اور اسلام اب پندرہویں صدی کے مدار میں داخل ہو چکا ہے، یہ واضح رہے کہ ریڈرز ڈائجسٹ کی ۱۳ زبانوں میں سو ملین کاپیاں ۳۹ ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور عام طور پر ہر تعلیم یافتہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ ہے چودہ[۱۴] سو سالوں کا ایک تاریخی زائچہ جو سرسری طور پر پیش کیا گیا ہے، مستشرقین کی اسکالرشپ اور مغربی مجلات ورسائل اور چھاپہ خانوں اور مطابع کی واضح اسلام دشمن پالیسی اور تغیر لون تاریخی عناصر کے ساتھ ناظرین کے سامنے ہے، ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک

موقف میں فرق نہیں آیا۔

مغربی جامعات میں دراسات اسلامیہ کی مشکلات عملی تجربات ومشاہدات کی روشنی میں،

مغربی یا امریکی جامعات میں علوم اسلامیہ مثلاً تاریخ اسلام، عقائد وعلم کلام یا فلسفہ کا مطالعہ نہ صرف مشکل ہے، بلکہ نا ممکن بھی ہے، یہاں مسلم طلبہ اور اساتذہ کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہیں جو اپنے دین حنیف سے محبت کی بنا پر تمسیخ دین کے لیے تیار نہیں، ان کے لئے دو ہی راہیں کھلی ہوئی ہیں یا تو اسلامی مضامین چھوڑ کر دوسرے مضامین کا انتخاب کریں یا پھر جامعہ کو ہی خیر آباد کہیں..... بہت سے طلبہ جنھوں نے اپنے دین کی حفاظت کیلئے ڈگری کی پرواہ نہیں کی وہ جامعہ ترک کرنے پر مجبور ہوئے، اس لئے کہ اساتذہ یا مشیران تعلیم اور ایڈمنسٹریٹر سے ذہنی تصادم کے بعد وہاں رہنا مشکل تھا، بعض حالات میں اسکالرشپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے، ایسے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، طلبہ واساتذہ کی دوسری قسم افسوسناک حد تک مایوس کن ہے، اس گروہ گوسفنداں میں ایسے مسلم اساتذہ اور طلبہ موجود ہیں، جو ذاتی منفعت، یہود ونصاری اساتذہ کی خوشنودی، ملازمت میں استحکام اور ترقی کی آرزو میں نہ صرف اسلام پر حملوں کو برداشت کرتے ہیں، بلکہ خود بھی ایسے مقالات تحریر کرتے ہیں جن میں اسلام پر صریح حملے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک طالب علم نے استاذ کو خوش کرنے کے لیے خلفائے راشدین میں سے ایک خلیفہ پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ خود عیسائی استاذ نے تبصرہ میں لکھ دیا کہ زیر بحث خلیفہ کے ساتھ طالب علم نے ناانصافی کی ہے اور ظلم بھی،

امریکی اورنیٹل کانفرنس کا ایک سالانہ اجلاس نیویارک میں منعقد ہوا، راقم سطور بھی مدعو تھا، ایک مستشرق نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ نے قرآن کی تالیف میں ام المومنین ماریہ قبطیہ سے کیا کیا استفادے کیے، مقالہ کے اختتام پر لوگوں نے مبارکباد پیش کی مقالہ نگار کو داد وتحسین پیش کرتے ہوئے ایک مسلمان پروفیسر نے کہا "واللہ خوب مقالہ تھا، سبحان اللہ کیا ریسرچ اور تحقیق تھی۔ ہم

ان معلومات سے محروم تھے، جزاک اللہ .... وغیرہ۔

رقم الحروف پروفیسر مذکور کی پشت پر ہی کھڑا ہوا تھا، جس کا علم پروفیسر صاحب کو نہ تھا، جب وہ پلٹے اور دیکھا کہ راقم سطور نے انھیں اس قسم کی داد و تحسین دیتے ہوئے سن لیا تو وہ پانی پانی ہو گئے اور پھر کبھی آنکھیں دوچار نہ کر سکے، یہ خوشامدانہ کلمات تحسین محض اس لئے پیش کئے گئے کہ ان کی ملازمت کے دوام و استحکام میں ان کی اعانت ہو سکے، مگر استاد مذکور کچھ دنوں بعد بڑی رسوائی کے ساتھ جامعہ سے نکالے گئے۔

ایک طالب علم نے جو اسلامی عقائد کو اپنی زیست کی علامت اور اپنے وجود کا تعارفی نشان تصور کرتا تھا ایک مقالہ "قرآن عہد ابتدائی اسلامی کلچر" یعنی ابتدائی اسلامی کلچر کے ارتقاء میں قرآن کا کیا کردار (رول) رہا ہے کے عنوان سے ایک جامعہ میں پیش کیا، مگر ان پروفیسر نے مقالہ کو اس کے سامنے اس تبصرہ کے ساتھ پھینک دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی علمی مقالہ ہوا، جس میں نہ تو محمدؐ پر تنقید کی گئی ہے، نہ ہی قرآن پاک پر نقد و جرح ہے، محمدؐ نے (نعوذ باللہ) مکہ اور مدینہ میں کیا کیا چولے بدلے، اس کا کوئی ذکر بھی نہیں، ان نظریات کے ساتھ تو مغربی یا امریکی جامعات میں سے کسی جامعہ میں گذر بسر ممکن نہیں، متعلم مذکور نے یہ کہکر کہ وہ ڈگری کے لئے اپنے ایمان اور عقائد کا سودا کرنے کو تیار نہیں۔ استاذ مذکور کا کورس چھوڑ کر دوسرا کورس لے لیا، ایک مسلم ہندستانی طالب علم ایک معروف اور نامی گرامی مستشرق کے زیر تربیت تھا، اور ساتھ ہی ایک معروف مسلم استاد یا اسکالر، جو مستشرقین سے بھی بازی لے جانے کو تیار تھے، کا پروردہ تھا، اس نے اسلام پر ایک تقریر کے دوران اسلامی عقائد اور ایمان بالغیب پر ایسی باتیں عرض کرنے لگا جیسے کوئی معتزلی قبر سے اٹھ کر آگیا ہو، وہی پر حملے کرتے ہوئے عرض کیا کہ اسلام عام طور پر تقلید پر زور دیتا ہے، اور آزادی فکر یا عقل اور معقولیت سے دور لے جاتا ہے، اس قسم کے جملے عام طور پر مستشرقین کے محبوب مضامین ہیں، ایسے ذہین نوجوان جب تربیت پاکر مسلم ممالک میں واپس آتے ہیں، اور اعلیٰ عہدوں اور مناصب

اقتدار پر فائز ہوتے ہیں تو عالم اسلام کیلئے مستقل مسئلہ بن جاتے ہیں، آج عالم اسلام اسی المیہ کو دوچار ہے، یہ کوئی معمولی فتنہ نہیں ہے، یہ امر فوری طور پر محتاج توجہ ہے،

تجاویز: مباحث بالا کی روشنی میں حسب ذیل تجاویز پر غور کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے، ورنہ سیمینار اور کانفرنس محض نشستند و گفتند و برخاستند کے مترادف ہونگی، چونکہ دار المصنفین اعظم گڈھ کی یہ عظیم تاریخی کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء سنگ میل اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے مخصوص تجاویز پر غور و فکر کی فوری ضرورت ہے، ان تجاویز میں سے بعض حسب ذیل ہیں،

۱۔ قرآن کریم کی ہدایات کی روشنی میں آیت کریمہ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى کو رہنما اصول تسلیم کر لیا جائے، تاکہ اسلامی دانش گاہیں اور دانشوران ریسرچ ادارے اور محققین سب واضح ذہن کے ساتھ مستشرقین کی تالیفات کا مطالعہ کریں، اور نقد سے صرف نظر نہ کریں، مسلم حکمرانوں نے آیات قرآنی سے سرتابی کے بعد جو سزا پائی ہے اور جس کی مثالیں آج سب سے نمایاں ہیں، اس کا اثر سارے عالم اسلام پر ظاہر ہے، اسلامی ریسرچ کو اس انحطاط اور زوال سے محفوظ کرنے کے لئے ان آیات کی روشنی میں واضح پالیسی مرتب کرنے کی ضرورت ہے، ہماری جامعات میں عربی و فارسی مصادر سے ناواقف مسلم اساتذہ ہی مستشرقین کی تالیفات پر بھروسہ کر کے اعتماد کے ساتھ اپنے طلبہ کو زہریلا مواد پلا دیتے ہیں، عربی سے ناواقفیت کی بنا پر وہ مجبور و معذور ہو چکے ہیں، ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے، کہ وہ خود عربی، فارسی یا اردو کتب کا مطالعہ کر سکیں، ہندوپاک کے اساتذہ کا بھی یہی حال ہے، یورپ کی زبانوں میں جو کثرت سے مستعمل ہیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں علوم اسلامیہ پر بکثرت لٹریچر فراہم کیا جائے، اردو، فارسی اور عربی کتب کے تراجم کے ساتھ ساتھ اسلامی ادب و افکار کا ذخیرہ

فراہم کیا جائے۔ مستشرقین کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انھوں نے اسلام دشمن لٹریچر کا دروازہ کھول دیا جس نے ہر مسلم گھرانے، جامعات، بازار اور دکانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور خام غیر تربیت یافتہ مسلم ذہنوں کی تغسیل کا بہترین آلہ کار بن گیا۔

۳۔ خالص اسلامی لٹریچر کی ترویج کے لیے تین اہم مراحل درپیش ہیں۔

الف: ایک ایسا اشاعتی پریس قائم کیا جائے جہاں عالم اسلام کے اسکالر اپنی کاوشات اور ریسرچ پروجکٹ کی اشاعت کرا سکیں مغرب کے پریس نے یہی کام انجام دیا ہے، عالم اسلام کے بہترین مفکر اور اسکالرز اپنی فکری کاوشات کی اشاعت سے اسی لیے محروم ہیں کہ اسکا کوئی نظم نہیں ہے، اسی لئے عالم اسلام میں نہ تو زرخیز ذہنوں کے تحفظ کا احساس ہے نہ ہی اسکا کوئی نظم کیا گیا ہے، یورپ میں احتفاظ لیاقت و ذہن کی ایک مستقل علمی تحریک بن چکی ہے۔

ب: ایک دار الترجمہ قائم کیا جائے جہاں عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کے تراجم ممتاز مغربی زبانوں میں کئے جا سکیں اور طباعت کے بعد انھیں عالمی مارکٹ میں فراہم کیا جائے، مستشرقین کے علمی سیلاب کی روک تھام کیلئے ضروری ہے کہ اسی قوت و طاقت کے ساتھ انسانی اسلامی ادب فراہم کیا جائے۔

ج: عالمی مسلم اسکالرز کا ایک انڈکس تیار کیا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ دنیا میں مسلم اسکالرز کن کن موضوعات پر اور کہاں کہاں ریسرچ میں منہمک ہیں، اس انڈکس کے ذریعہ تکرار موضوعات اور تضییع اوقات دونوں سے بچا جا سکتا ہے، اور بین الاقوامی تعاون اور اشتراک فکر و نظر کی تحریک پیدا کی جا سکتی ہے، اس تعاون او موالات کی آج بے حد کمی ہے، بلکہ عالمی اسکالرز کا تعارف تو کجا ان کے کارناموں سے بھی واقفیت نہیں ہے، یہ تعارفی انڈکس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگا۔

۴۔ یورپ میں تیار کردہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ کرانے کے بجائے ایک نیا اسلامی انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے جسمیں لکھنے والے سر تا سر مسلم اسکالرز ہوں، اسمیں دیر لگ سکتی ہے، مگر یہ تاخیر باعث تشویش نہیں، یورپ نے جو اسلامی انسائیکلوپیڈیا تیار کیا گیا ہے اسے قطعی مسترد کر دیا جائے۔ اور ان پر اعتماد کرنے کے بجائے خالص مسلم اسکالرز کی تحقیقات اور کاوشوں کو مراجع اور مصادر اصلیہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

۵۔ مذکورہ بالا پروجکٹ کیلئے مالیاتی فنڈ کی ضرورت ہوگی، اس فنڈ کو اسلامی لٹریچر تیار کرنے، سمینار اور کانفرنس کے انعقاد اور دیگر اشاعتی کاموں کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مستشرقین کی اسلام دشمن تالیفات ×

اور عالمی مشنری کونسل کو جو ملین در ملین ڈالر کی
چرچ کا فنڈ کس طرح استعمال کیا جاتا ہے
رقمیں ملتی ہیں وہ عیسائی حکومتوں اور عوام دونوں کا عطیہ ہوتی ہیں، تاکہ ایک طرف جہاں مسیحی مذہب کی اشاعت و ترویج کا اہتمام کیا جائے وہاں اسلام کے خلاف رجحانات کے خیال میں عیسائیت کا دشمن ہے، لٹریچر کا انبار لگا دیا جائے۔

۶۔ ضرورت ہے کہ مسلم ممالک کی جامعات میں خالص ریسرچ اسکالر اساتذہ کا تقرر عمل میں آئے، تدریسی اساتذہ کا تقرر تو عام ہے، یہ اساتذہ سال بھر تعلیم و تدریس، لکچرز اور امتحانات میں مصروف ہونے کی وجہ سے ریسرچ کا کام کرنے سے معذور و مجبور رہتے ہیں، غیر معمولی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تحقیقی مشاغل مشکل ہیں، یورپ کے اکثر ممالک میں خاص کر فرانس جو مادر افکار کے نام سے معروف ہے، تدریسی اساتذہ کے ساتھ خالص ریسرچ پروفیسر کا تقرر ہوتا ہے، جو سال بھر صرف ریسرچ کرتے رہتے ہیں، تدریس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس طرح گوناگوں افکار و خیالات کے ذریعہ وہ اپنی ملت کو فکری طور پر زرخیز رکھتے ہیں، اور ذہنی خشک سالی اور قحط الرجال سے قوم و ملک کو بچاتے رہتے ہیں، یہاں تدریسی و تحقیقی اساتذہ کی تنخواہیں برابر ہوتی ہیں، اور بعض اساتذہ حکومت یا ریسرچ اداروں کے متعین کردہ پروجکٹ پر کام کرتے ہیں، اور بعض خود اپنا پروجکٹ حکومت یا ریسرچ اداروں سے منظور کروا لیتے ہیں اور پھر ان پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں، افکار نو کی اپج اور ذہن کی یہ زرخیزی ہی یورپ کی زیست کا سامان فراہم کرتی ہے، ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں اور ان کی ریسرچ اکیڈمیاں وغیرہ فوری طور پر اس طرف توجہ کریں، اور تعلیم و ریسرچ کو قومی منصوبوں میں اولیت دیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا   اللہ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے

مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (مجادلہ) اور جن کو علم دیا گیا درجے بلند کرے گا،

علم و ایمان ترقی کے لئے جزو لاینفک ہیں۔

۷۔ مستشرقین کے ساتھ الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک طرف اسلامی ادبی ذخیرہ فراہم کیا جائے اور دوسری طرف مستشرقین کی تالیفات کا تحلیلی مطالعہ کیا جائے۔ مستشرقین کی ایک اہم پالیسی یہ بھی رہی ہے۔ کہ نت نئے مسائل اور اعتراضات اٹھائے جائیں اور اسلام کے خلاف پے در پے حملے کئے جائیں تاکہ مسلم محققین اپنی تمام تر ذہنی و فکری قوتیں بجائے مفید کاموں کے، ان حملوں کے جوابات میں صرف کرتے رہیں، اور اس طرح انھیں کبھی اس کا موقع نہ مل سکے کہ وہ اپنا ذخیرہ اسلامی ادب منظر عام پر لا سکیں، اس پالیسی کو آج تک کماحقہ نہیں سمجھا گیا ہے۔ مسلم اسکالرز کا ایک طبقہ اساطین مستشرقین کی ایک ایک کتاب کا تقابلی مطالعہ ضرور کر سکتا ہے، اس کی اشد ضرورت ہے۔ کہ ترجمہ یا اڈیٹنگ کے نسخوں کا اصل عربی متن سے مقابلہ کیا جائے، لغوی، اور معنوی تسامحات کا جائزہ لیا جائے اسطرح ایک خالص علمی اور تنقیدی ادب کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ عوام کی نظر ان تسامحات پر پڑ سکے جن پر محض علم و تحقیق کا غلاف پڑا ہوا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان تالیفات میں تمسیخ علوم السلامیہ اور تاریخ اسلام کی دانستہ نفی کی گئی ہے، اور یہی ان حضرات کی علمی تفسیر بھی ہیں، کسی ایک مستشرق کا احاطہ ایک مسلم اسکالر کے بس کی بات نہیں ہے، فرداً فرداً ہر تالیف کی تحلیل و تنقید کے لیے ایک نہیں متعدد مسلم دانشوروں کی ضرورت پڑے گی، تاکہ وہ دیانت و امانت کے ساتھ بلا تعصب مستشرقین کا علمی محاسبہ کر سکیں، اور ان عوامل و محرکات کا تجزیہ کر سکیں جو ان تالیفات کا سبب بنیں، کوئی ایسا مستشرق نہیں لے گا،

جس کا دامن تعصب کی آلائشوں سے پاک ہو یا جو صادق الامین ہو یا خالص علمی و تحقیقی جذبہ کے ساتھ دراساتِ اسلامیہ کی طرف مائل ہوا ہو۔

جن مستشرقین نے بڑے زور و شور کے ساتھ برملا اسلام کی تعریف کی ہے، ان کے جادو سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے اصل منشاء اور مقصد پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات قاری مستشرقین کی پانچ اور چھ سات سو صفحات پر مشتمل کتاب پڑھ جاتا ہے، اس میں اسلام کی تعریف ہی تعریف نظر آتی ہے، لیکن آخر میں مولف کے تلخیصی کلمات کو پڑھ کر وہ ششدر رہ جاتا ہے، ضخیم کتاب کا مولف اپنی تعریفات کے بعد لکھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمدؐ کاذب تھے اور اسلام یہودی و عیسائی مذاہب کا چربہ ہے، ہمارے اعتذاری مسلم نوجوان جو مستشرقین کی اسکالرشپ سے بے حد متاثر ہیں، اور ان کی تعریفات میں رطب اللسان بھی ہیں، ان سے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انھوں نے نہ تو کسی ایک مولف کی پوری فکری شخصیت کا تجزیہ کیا ہے نہ ہی اس کی تمام تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، ادھر ادھر سے مطالعہ کے بعد اپنی رائے قائم کر لی یا دیگر اصحاب کے تبصروں پر اپنی رائے کی اساس ڈال دی، یہ بے حد خطرناک علامت ہے، یہ کہنا کہ کارلائل نے اسلام کے بارے میں خوب لکھا ہے، گبن یہ کہتا ہے، ٹوائن بی یہ کہتا ہے، اور ولیم میور نے اس کا اعتراف کیا ہے وغیرہ وغیرہ کلمات بے حد خطرناک ہیں، کیونکہ کم علم طالب علم ان کلمات سے متاثر ہو کر مغالطہ میں آجاتا ہے، اور اس پورے زہر کو پی جاتا ہے، جو ان مولفین نے شکر میں لپیٹ کر شوگر پل کی طرح اپنے صفحات میں پیش کیا ہے، اور جب وہ کتاب کے اختتام پر پہونچ کر تلخیصی کلمات پڑھتا ہے تو اس کے دماغ میں اسلام کے بارہ میں بعینہٖ وہی سوالات، شکوک اور شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جو مستشرق مولف پیدا کرنا چاہتا ہے،

بچے کو تلخ دوا یا تو شکر ملا کر یا شربت کا رنگ دے کر دھوکے سے پلا دیا جاتا ہے، اور بچہ اسے پی بھی لیتا ہے، لیکن ایک دانا و فرزانہ کے لیے اس تلخی کو گھونٹنا مشکل ہے،

مندرجہ بالا مباحث سے مستشرقین کی تخبیصات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ زہر کو کس طرح نئے جام میں گھول کر پلا دیتے ہیں، یہاں پر ایک اور مثال بے حد ضروری ہے، اور مفید بھی، یہ ایک کلاسیکی مثال ہے، جس پر دوسروں کا قیاس بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسپین کی میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی ادبیات کے استاد پروفیسر پلاسیوس نے ۱۹۱۹ء میں اپنی کتاب میڈرڈ سے شائع کرائی، تحقیق کا موضوع دانتے کے اصل مصادر کی سراغ رسانی تھا، پچیس سالہ تحقیق و جستجو کے بعد مولف اس نتیجہ پر پہونچا کہ دانتے کی شہرۂ آفاق کامیڈی، بنیادی خیالات میں نہ صرف واقعہ معراج رسولؐ کے مشابہ ہے، بلکہ معراج سے متعلق دیگر ادبی و دینی مواد، مثلاً ابن عربی کی فتوحات اور معری کی رسالۃ الغفران کے مضامین کا چربہ بھی ہے، اور ساخت اور نمونہ میں ہو بہو ان کی نقل بھی، معمولی تبدیلیوں مثلاً ناموں کے فرق کے ساتھ وہی خیالات اور نمونے پیش کیے گئے ہیں، جو احادیث معراج میں موجود ہیں۔

تحقیق کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ سنسنی خیز تھا، مولف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود عیسائی مذہب نے بے شمار اسلامی تصورات کو اپنایا ہے، ان میں حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا واضح عقیدہ خاص اسلامی ہے جسے عیسائیت نے اپنا لیا، عیسائیت کے اندر حیات بعد موت کا تصور ہی نہیں تھا، غرض اسلامی عقیدہ بعد میں چرچ کا اور چرچ کے پادریوں کا ممتاز عقیدہ بن گیا، مولف نے یہ بھی ثابت کیا کہ پادریوں کے روحانی سفر کے مختلف واقعات اور داستانیں واقعۂ معراج کی نقالی ہیں، یہاں پر یہ امر واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ مولف کی یہ تحقیقات اسلام دوستی پر مبنی نہیں، جب اسپین اور اٹلی کے درمیان قومیت اور

عصبیت کی آگ بھڑکی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلی تو اسکالر بھی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں تیل ڈالنے لگے، میڈرڈ کے پروفیسر نے اٹلی کو کمتر ثابت کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا، اطالوی ادب کے بائبل یعنی دانتے کی کامیڈی کو مسرت زا قرار دیا، یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ دانتے نے اپنا سارا مواد واقعہ معراج اور احادیث معراج سے اخذ کیا ہے، لیکن پلاسیوس کے اندر اٹلی کے خلاف نفرت کا جذبہ تھا، مولف خود ایک کیتھولک پادری تھا، اور اسی عام مسیحی نظریہ کا حامی بھی تھا، جس پر عیسائی روز اول سے عقیدہ رکھتے ہیں، اصل ہسپانوی کتاب کا انگریزی ترجمہ و تلخیص ۱۹۲۶ء میں لندن سے اسلام اور ڈوائن کمیڈی کے زیر عنوان ہیرالڈ سنڈرلینڈ نے پیش کیا، اصل ہسپانوی کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۳ء اور انگریزی ترجمہ کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء راقم الحروف کے مطالعہ میں ہے، مترجم نے اصل سے بعض اسناد وغیرہ حذف کر دی ہیں، لیکن اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، (کتاب کا دوسرا تازہ ترین انگریزی ایڈیشن بھی جو ۱۹۶۸ء میں ۲۹۵ صفحات پر مشتمل ہے شائع ہو چکا ہے) شروع سے آخر تک اس کتاب کا مطالعہ نہایت صبر آزما ہے، دانتے بلکہ دین مسیح پر من حیث مجموعی اسلامی اثرات کی فہرست دیکھ کر قاری خوشی محسوس کرتا ہے، مولف کو فراخ دل، غیر متعصب، منصف، روادار قرار دیتا ہے، مگر کتاب کے آخر میں مولف نے لن ترانی کی تفسیر پیش کر دی اور اسی عام مسیحی عقیدہ کا اظہار کر دیا یعنی اسلام، یہودی اور عیسائی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہے، (ملاحظہ ہو مولف کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ایڈیشن ۱۹۱۱ء آخری صفحہ ۲۷۷ کا آخری پیراگراف)

ان حقائق سے یہ بات قطعی آشکار ہے کہ مستشرقین کا خانوادہ، خواہ مشرقی چرچ کا

پروردہ ہو خواہ مغربی چرچ کا، عقائد میں مختلف نہیں، اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں بھی مختلف نہیں، شعر و ادب کے مطالعہ میں پاسیوز نے ۲۵ سال صرف کیے اور آخر میں ثابت کر دیا کہ دانتے کی شاعری مجموعۂ سرقات ہے، اور معراج محمدؐ سے ماخوذ ہے (اگرچہ محمدؐ نبی کاذب تھے، اور اسلام دھوکہ کی ٹٹی ہے) آج ہمارے بعض دانشوران مستشرقین کے بڑے مداح ہیں، جو مسلم شعراء اور ادبی سرمایہ کو مغربی زبانوں میں منتقل کر کے اہل مغرب کو اسلامی کلچر اور ثقافت سے متعارف کرا رہے ہیں۔ ہم نہ تو اس کے مخالف ہیں نہ ہی اس کے خلاف تعصب کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، البتہ چند گوشوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں

پہلے مسیحی مشنری اسلام کے خلاف محاذ آرا تھی، صدیوں کی انتھک جنگ کے بعد مشنری والوں کو یقین آگیا کہ تبلیغی پلیٹ فارم سے قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ پر حملہ ناکام رہا، انھوں نے اسٹریٹجی بدل ڈالی مشنری مبلغین کو تعلیمی عبا و جبہ پہنا کر جامعات میں علوم اسلامیہ کے اسکالر کی حیثیت سے گھسا دیا، اور سارے عالم میں دھوم مچا دی کہ فلاں شخص دنیا میں اسلامی قانون کا ماہر ہے، اور فلاں فلسفہ و کلام کا ماہر ہے، اور فلاں اسلامی ادب اور شعر و سخن کا ماہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ مغربی جامعات میں سامی شعبوں سے آزاد اور مستقل بالذات ادارے کھولے جانے لگے، کہیں ان کا نام شعبہ جاتِ دراساتِ اسلامیہ رکھا گیا، اور کہیں ادارۂ دراسات شرق اوسط کا نام دیا گیا وغیرہ وغیرہ، جامعات کے ان اداروں سے اسلام دشمن ادب کا انبار لگا دیا گیا، میدان جنگ صلیب میں تلوار سے قتل کرنے کے بجائے جامعات میں ہی مقتل سجائے گئے، بقول عارف اکبر۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

جب مستشرقین نے محسوس کیا کہ اسلام دشمن ادب بھی بے اثر ہو رہا ہے، اس کی

قوت ٹوٹتی جا رہی ہے تو انھوں نے نیا مدخل تلاش کیا، وہ مدخل دینیات کے بجائے قدیم کلچر اور تاریخ کا مدخل تھا، جس طرح اشتراکی نیٹ کے راستہ سے گھس کر دنیا میں ہل چل مچا دی اسی طرح بعض مستشرقین نے کلچر کے نام پر عالم اسلام میں ہلچل مچا دی، فراعنۂ مصر کا مطالعہ کیا اور اسلام کو کلچر دشمن مذہب قرار دے کر خود اہل مصر میں فراعنۂ مصر کے ساتھ ہمدردی پیدا کر دی اور اسلام کو غاصب قرار دینے کی تحریک چلا دی، ایران میں سائرس سے ایسی محبت پیدا کی کہ اسلام کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، پاکستان میں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تمجید اور انڈس ویلی تہذیب کی حمد و ثنا میں تحریری تحریک چلائی، ایک طبقہ نے اسلام کو حملہ آور اور غاصب قرار دے کر اسے کلچر و ثقافت کا دشمن قرار دیدیا، شعراء نے اس پر نظمیں لکھیں اور اپنا رشتہ محمد بن قاسم کے بجائے راجہ داہر سے قائم کرنا شروع کر دیا، کلچرل مسلم کی نئی تحریک چل پڑی، یعنی ہم بطور حادثہ مسلم کلچرل حلقہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلم ہیں، مذہبی مسلم کہنے کے بجائے کلچرل مسلم کہنا زیادہ مفید ہوگا، ان موضوعات پر مستشرقین کی تصنیفات موجود ہیں جن کی تفصیلات کا یہاں موقع ہے نہ ہی وہ موضوع کا حصہ ہیں۔

بعض مستشرقین شعر و ادب کے راستہ سے گھسے اور اقبال و غالب و حالی کے نام پر دراسات کا سلسلہ شروع کیا جو بلاشبہ خوش آیند اور محمود اقدام تھا، اقبال بعض کی نظر میں مجموعۂ تضاد قرار پائے اور محمدؐ کے عصباتی دین کے مبلغ بھی، یہاں پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ شعر و ادب کے مطالعہ میں بھی عقائد کا ٹکراؤ لازمی ہے، فن میں عقیدہ کی آمیزش فطری امر ہے، رومی ہوں یا اقبال، ابن عربی ہوں یا بوصیری، ان کے کلام و پیام میں اسلامی عقیدہ، تصوف روحانیت، غیر مرئیات و ماورا کا سارا کا سارا نظام رچا بسا ہوا ہے، ان کے فن سے اگر ان کا پیام نکال دیا جائے تو وہ صرف ردیف و قافیہ اور الفاظ کا ڈھانچہ ہی رہ جائے گا، فن اور فن کار میں ازلی ربط ہے، فنکار کے عقائد اس کی انسانی ذات کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ اس کے فن کی فعال روح بھی، ہر فن کے اندر فن کار کی جیتی جاگتی تصویر

. . . .

نظر آتی ہے۔ دنیا کا کوئی عظیم شاعر یا اس کا فن اس کے عقیدہ سے مبرا نہیں ہو سکتا، بلکہ شعری و ادبی
مواد و ہئیت تک میں فن کار کی ذات تحلیل ہو جاتی ہے۔ فن کا جمالیاتی شعور دینی و سیاسی، سماجی
بلکہ معاشی عقائد تک اس کے فن کا حصہ ہیں واردات قلب اور کوائفِ نفس کے ساتھ یہ
عقائد بھی اس کی انسانی ذات کا جزو لاینفک ہیں، یہی مختلف خیالات و نظریات یا عقائد
اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں، کسی دور کا ادب محض ہم عصر فنی محاسن، صنائع و بدائع
کی بناء پر مقبول نہیں ہوتا بلکہ اس کی عوامی مقبولیت میں ہم عصر روایات اور عقائد کی آمیزش
اور گھلاوٹ اور ملاوٹ کا بھی دخل ہوتا ہے۔ خود یورپ کے ادب سے دو تین عالمی فن پاروں کی
مثالیں کافی ہیں، آٹھ صدی قبل مسیح کا مقبول فنکار ہومر (جس کی ذات ہنوز محلِ نزاع ہے)
اور اس کی رزمیہ نظمیں ایلیڈ اور اوڈیسے میں نہ صرف قدیم یونانی وثنی عقائد کی آمیزش ہی، بلکہ
انسانی معاملات میں اولمپیا کے خداؤں و دیوی دیوتاؤں کا واضح عمل دخل بھی ہے، اسی طرح روما کے
معروف وثنی شاعر ورجل کی شہرہ آفاق رزمیہ نظم "اینائڈ" دیومالائی قصوں اور وثنی عقائد سے
مرصع ہے۔ دو عالمی شہرت کے مسیحی شعراء کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے، ملٹن اور دانتے ذوی
عالمی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں، ان کی شاعری محض ان کے عقائد کی ترجمان ہے، اول الذکر نے
خالص پیورٹن عقائد کا اظہار کیا، اور آخر الذکر نے متقشف کیتھولک عقائد کا اظہار کیا، ملٹن کی
تین مذہبی نظمیں شہرۂ آفاق ہیں، چرچ کی بے جان مذہبی روایات سے عاجز آ کر ملٹن نے تحریک
اصلاحات میں شرکت کی اور خالص بائبل کی روشنی میں دین مسیح کا احیاء کرنا چاہا، اس کے لئے
وہ تاج برطانیہ تک سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھا، برطانیہ میں شہنشاہیت ختم ہو گئی، مگر قائدین
اصلاحات کی باہمی کشمکش اور افتراق کی وجہ سے عود شاہی کا عمل ۱۶۶۰ء میں پیش آیا، ملٹن کی

شاعری پیورٹن تحریک کی کامیابی کا ترانہ تھی، اور دین مسیحی کے احیاء کا منشور بھی، اس کی فردوس
گم گشتہ (۱۶۶۷ء) سقوطِ آدم کی داستان حزیں کا ایک رزمیہ ہے، خطا کار آدم کو اس کے
ازلی گناہ سے ابن اللہ عیسیٰ نے نجات دی اور کفارہ ادا کر کے بنی آدم کو بچا لیا، لہٰذا بنی آدم کی
نجات اسی میں ہے کہ وہ عیسیٰ کو ابن اللہ تسلیم کر لیں، اس عقیدہ کے منکرین جہنمی ہیں ان کی نجات
ممکن نہیں، ملٹن کی دوسری مذہبی نظم فردوس بازیافتہ ہے جو ۱۶۶۵ء سے ۱۶۶۷ء کے
درمیان منظر عام پر آئی، اس میں ملٹن عیسائی عقیدہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے،
حاصل رزم یہ ہے کہ فردوس جو آدم کے ہاتھوں ضائع ہوئی تھی، عیسیٰ ابن اللہ کے ہاتھوں
واپس ملی، آدم شیطان کے مطیع ہو گئے، لیکن عیسیٰ اپنے باپ کے وفادار ثابت ہوئے اور شیطانی
ترغیبات کو ٹھکرا کر باپ کی وفاداری کا ثبوت پیش کیا، ملٹن کی تیسری معروف نظم سیمسن ہے،
جس کا مرکزی مضمون اولڈ ٹسٹامنٹ سے ماخوذ ہے، بالفاظ دیگر ملٹن کی کہانی سیمسن کی
زبانی ہے، کیا ملٹن کی شاعری کے عمودی مضامین مذہبی عقائد کی ترجمانی نہیں کرتے، پھر یہ کیسے
ممکن ہے کہ ملٹن کی شاعری عالمی فن پارے کا عروج قرار پائے اور اقبال کی شاعری محمدؐ کے
عصباتی دین کی عکاسی یا مجموعۂ تضاد بن جائے۔

ملٹن سے زیادہ دلچسپ مثال خود دانتے کی ہے، دانتے (۱۲۶۵ - ۱۳۲۱) نے
من حیث خالص کیتھولک، احیائے دین مسیح کی آرزو میں اپنی ڈوائن کمیڈی لکھ ڈالی،
اس نے نہ صرف شعری مواد میں عقائد کی آمیزش کی، بلکہ ہیئت کے سانچے میں بھی عقیدہ کو گھول کر
پلا دیا، نظم کی پوری ترتیب عقیدۂ تثلیث پر قائم ہے، ۳ اور ۹ کا لحاظ ساری نظم میں موجود
ہے، حد تو یہ ہے کہ قوافی میں بھی اس نے عقیدۂ تثلیث کے احیاء کے لئے، مثلث قوافی کی
ایجاد کی، پوری نظم مثلث بند میں لکھی گئی ہے، خلاصۂ نظم یہ ہے کہ انسانیت کی نجات محض

کیتھولک عقیدہ کو تسلیم کرنے میں ہے، چرچ کی زبوں حالی اور چرچ و ریاست کے تصادم پر وہ اشکبار ہے، اس کے خیال میں حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لانے والے جہنمی ہیں، کیا کوئی فارسی یا ناقدان عالمی شہ پاروں کو مواد و ہیئت میں عقائد کی آمیزش سے مبرا ثابت کر سکتا ہے،

جو مستشرقین اسلامی شعر و ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس مطالعہ کا حق ہے، مگر مسلمانوں کو بھی اس کا حق حاصل ہے، کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس مطالعہ میں اقبال کے فلسفہ توحید خودی و بے خودی، مرد مومن، عشق رسول کے نازک آبگینوں پر مستشرقین کے نشتر سے بال تو نہیں پڑ رہے ہیں؛ یا حالی کی غزل گوئی کی تعریف کے ساتھ ساتھ مسدس حالی کی تنقیص تو نہیں کی گئی ہے، ملٹن اور دانتے عصباتی و ہیجانی قرار نہیں پائے مگر ہمارے شعراء انفعالی قرار پائے، یہاں پر دو ایک مزید شواہد کی ضرورت ہے، ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں راقم کی نظروں سے ایک خط گزرا جو شاعر انقلاب نذر الاسلام کے خط کا جواب تھا، آخر الذکر نے اول الذکر کو نوبل پرائز حاصل کرنے پر مبارکباد کا خط لکھا، اس خط کے جواب میں آخر الذکر یعنی ٹیگور نے لکھا کہ تمھاری (نذر الاسلام) شاعری کے مقابلہ میں ہماری شاعری فروتر ہے، نوبل پرائز کے اصل مستحق تم تھے ہم نہیں، مگر مستشرقین کی ٹولی نے اپنے خود ساختہ فیصلوں میں مسلم شاعر کو من حیث ہیجانی شاعر مستحق نوبل پرائز نہیں سمجھا، ٹیگور کی دھوم سارے عالم میں مچ گئی، مگر نذر الاسلام مجہول الحال رہا، وہ شاعر انقلاب جو حریت و آزادی کے گیت گاتا تھا، ظالم برطانیہ نے جب اس جرم میں اس کو گرفتار کر کے رانچی کے جیل میں قید کیا تو قلم سیاہی اور کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی اس کے کمرہ میں رہنے نہ دیا، اس نے بلیڈ سے رگ جاں کھول کر خون کے فوارے جاری کر دیے اور انگلیوں سے کمرہ کی پوری دیوار پر حریت و آزادی کے ترانے لکھ ڈالے، ع

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہمیں ان خطرات سے باخبر رہنا چاہیے، اور محض اس لیے کہ مغربی اسکالر ہمارے شعراء و ادباء کو مغرب میں متعارف کر رہے ہیں، ہمیں سرور کے نشہ میں خطرہ کے نشانات سے بے تعلق نہ ہونا چاہیے، مغربی جامعات میں اسلامی تحریکات مثلاً اخوان، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھے جا رہے ہیں، ساتھ ہی تحریکی شخصیات مثلاً حسن بنا، مولانا مودودی، مولانا الیاسؒ پر تحقیقات جاری ہیں، ان کے شر و خیر، محاسن و معائب سے بھی باخبر رہنا ضروری ہے، یہ دراسات اس لیے بھی کی جاتی ہیں کہ اسلام کی سربستہ قوت کا راز معلوم کر کے اس کی کاٹ کا سامان پیدا کیا جائے، اور اتحاد اسلامی اور وحدت امت کے تمام عوامل دواعی و محرکات کو کچل کر افتراق و انتشار کی صورت پیدا کی جائے تاکہ استعماری قوتیں عالم اسلام میں کچھ نہ کچھ شر انگیزی کرتی رہیں، اور مشنری مبلغین کی اپنی پالیسی اسی کے مطابق بناتے رہیں۔

بطور تلخیص یہاں پر عرض کیا جا سکتا ہے، کہ اسلام فروغ علم کا داعی ہے اور خذ ما صفا ودع ما کدر کا اعلان آفاقی اعلان ہے، مستشرق ہو یا غیر مستشرق ہر ایک کی تالیف جو طاہر و مطہر ہو گی، قابل قبول ہو گی اور ہونی چاہیے، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہو گا، کہ جس طرح کوئی مسلم مؤلف حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ تسلیم کرنے یا آیت لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کے خلاف جانے کے لیے تیار نہ ہو گا، عقیدۂ تثلیث یا حلول کو قبول کرنے سے انکار کرے گا، اسی طرح ہر مستشرق قرآن کو کلام الٰہی، محمدؐ کو نبی آخر الزماں اور اسلام کو دین الٰہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو گا، اور یہ تصادم ازلی ہے۔

وہ دن امت اسلامیہ کے لئے دس محرم سے زیادہ تاریک ہوگا، اور سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) پر سعدی کے مرثیہ سے زیادہ دلدوز اور دل سوز ہوگا جس دن مسلمان علوم اسلامیہ کی تفسیر و تعبیر کے لئے قرآن و حدیث کی تدوین و تحلیل کے لئے، تاریخ و فلسفۂ اسلام کی توضیح کے لئے مستشرقین پر انحصار کریں گے اور مدد کے لئے ان کے دروازہ پر دستک دیں گے۔

شاید ہی کوئی ایسا اسلامی مصدر بچا ہو جو مستشرقین کی تحریف سے مامون رہا ہو، اور علامہ محمد بن سعد کی الطبقات الکبریٰ کو لیجئے، مستشرقین کی تحقیقات کے ساتھ اس کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کی غلطیوں کا احاطہ مشکل ہے، جس قدر تصحیف و تحریف ابن سعد کے مطبوعہ نسخوں میں ہوئی ہے حیرت ناک ہے۔ ان اغلاط کو دامن عفو میں جگہ دینا، ان کی محنت اور دیدہ ریزی و جانکاہ کاوشات کی تحسین نہیں بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر غلاف ڈالنے کے مترادف ہے،

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

ہم مستشرقین کے کارناموں کے منکر نہیں، اور نہ ان کے پاکیزہ کارناموں کو منفی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، البتہ ہم مسخ کو تجدید نہیں کہہ سکتے، عالم اسلام کی انشائی قوت مفلوج نہیں ہوئی ہے، سقوط بغداد کے بعد بھی انشائی عمل جاری رہا۔ سترہویں صدی سے استعمار نے عالم اسلام پر تسلط قائم کیا جو دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا، اس عرصہ میں تمام اسلامی نوادرات کی لوٹ جاری رہی، مسلمان سائنسدانوں کی کتابوں کا مطالعہ ہوا، ان کے ایڈیشن طبع ہوئے، اس لئے نہیں کہ انہیں اسلام سے محبت تھی، یا ان کے اندر اسلامی کلچر کے فروغ کا جذبہ تھا، بلکہ محض ان اسلامی علوم سے استفادہ مقصود تھا، اور یہ بات عام ہو چکی ہے کہ زوال عالم اسلام کے بعد ہی یورپ کا عروج و ارتقا ہوا، علمی ذخائر پر تسلط کے بعد اور ان کے مطالعہ تدریس و اشاعت کے بعد اچانک یورپ میں علمی بہار آئی۔

استعماری نظام تعلیم میں ریسرچ اور تحقیق کا حق صرف سفید فام اہل یورپ کو تھا، مقامی آبادی کو خواہ وہ برصغیر ہند و پاک میں ہو یا شرق اوسط میں، وسط ایشیا میں ہو یا ایشیائے بعید میں، صرف اتنا حق تھا کہ وہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرکے انگریزی، فرانسیسی اور ڈچ دفاتر میں کلرک کی حیثیت سے زندگی گذارے، تفکر و تدبر اس کا حق نہ تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک طرف استعمار کی کمر ٹوٹی، دوسری طرف عالم اسلام باوجود باہمی اختلافات کشمکش اور تصادم کے مستحکم ہونے لگا اور ربع صدی کے اندر اسلام دنیا کی تیسری قوت کی حیثیت سے ابھر کر نمودار ہو گیا، یہی اسلام جس کی تجہیز و تکفین کا سامان استعماری قوتیں اور ان کے اعوان و انصار مستشرقین کر چکے تھے، یہ محض خیال نہیں اس کے لیے تحریری شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں مستشرقین کی تحریروں سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی جانکنی کے منتظر تھے، مگر اچانک اس کی روح، قوت و اثر پذیری، حوصلہ اور امنگ کو دیکھ کر وہ ششدر اور حیران رہ گئے، بلکہ علوم اسلامیہ کے میدان سے ہارے ہوئے سپاہی کی طرح اب بھاگ رہے ہیں، یا چولے بدل رہے ہیں، دوسری طرف عالم اسلام کے حساس مفکرین نیا اسلامی ادب تیار کر رہے ہیں، اور مغرب پرست مسلم حکمرانوں کی پیہم سازشوں اور جوڑ توڑ کے باوجود ان کی مرضی کے خلاف عالم اسلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں کروٹ بدل رہی ہیں، نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہو رہی ہے، خالص اسلامی ادب استشراق کا پردہ چاک کر دے گا، دارالمصنفین اعظم گڈھ کا یہ بین الاقوامی سیمینار جو اسلام اور مستشرقین کے زیر عنوان منعقد کیا گیا ہے، اسی نئی شاہراہ کی سمت ایک برق رفتار سفر ہے، اور آیت "لن ترضیٰ" کی عملی تفسیر بھی ہے۔

مرأۃ الاسرار کا ایک جائزہ

از

جناب حسین احمد صاحب علوی، کاکوری، لکھنؤ

تقریباً تین سو چالیس سال پرانا ایک جامع تذکرہ ہے، جس میں صوفیائے کرام کے تمام مشہور سلسلوں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور قلندریہ وغیرہ کے مشہور بزرگوں، ان کے خلفاء اور مخصوص مریدوں کے حالات سلسلہ وار لکھے گئے ہیں، ہندوستان کے علاوہ ایران، افغانستان، ماوراء النہر کے مشائخ اور اولیاء اللہ کا بھی ذکر ہے، خصوصی توجہ ہندوستان کے مشائخ پر کی گئی ہے۔ جگہ جگہ بادشاہوں اور ان کے خاندانوں کی تفصیل ضمیمہ کے طور پر آگئی ہے، پوری کتاب میں اس طرح کے پانچ ضمیمے ہیں۔ پہلا حاشیہ مسئلہ وجود پر بحث کا ہے، دوسرا حاشیہ صفحہ ۷۰ پر ہے، جس میں امامت اور خلافت کے مسئلہ کو واضح کیا ہے،

چوتھا حاشیہ تصرفات اولیاء اللہ، پانچواں حاشیہ سوانحمری شاہ جہان بادشاہ۔

یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور ابھی تک غیر مطبوعہ، اکثر کتب خانوں میں اس کی نقلیں قلمی شکلوں میں پائی جاتی ہیں، اس کے مصنف مولانا شاہ عبدالرحمٰن چشتی امیٹھوی ہیں، جو اودھ کے چشتی مشرب کے جانے پہچانے مشہور مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ مرأۃ الولایت (حالات شیخ عبدالجلیل لکھنوی) ۱۰۳۲ھ، اوراد چشتیہ ۱۰۶۳ھ، مرأۃ مسعودی، مرأۃ مداری، مرأۃ المخلوقات ۱۰۴۱ھ، مرأۃ الجمال وغیرہ ان کی دوسری تصانیف ہیں، جن میں مرأۃ الاسرار سب سے

زیادہ مشہور ہوئی۔

ان کا روحانی سلسلہ رودولی ضلع بارہ بنکی کے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شیخ حمید کے واسطہ سے حضرت شیخ عبدالحق ردولوی سے ملتا ہے، شیخ حمید کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

این نیاز مند کاتب حروف بحیثیت ظاہر	اس نیاز مند لکھنے والے نے ظاہری
اقتباس مشرب صوفیا جیہ از خدمت	حیثیت سے اپنے وقت کے قطب
قطب الوقت حضرت شیخ حمید قدس	شیخ حمید قدس سرہٗ سے فیض حاصل کیا
سرہٗ نمودہ وے از پدر خود حضرت شیخ	اور انہوں نے اپنے والد شیخ قطب الدین
قطب الدین قدس سرہٗ وے از پدر خود	سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت
حضرت شیخ پیر قدس سرہٗ وے از پدر خود	شیخ پیر سے اور انہوں نے اپنے والد
حضرت شیخ بدھ قدس سرہ وے از	حضرت شیخ بدھ سے اور انہوں نے
پدر خود حضرت شیخ محمد قدس سرہٗ وے	اپنے والد حضرت شیخ محمد سے اور
از پدر خود حضرت شیخ عارف قدس	انہوں نے اپنے والد شیخ عارف سے
سرہٗ وے از پدر خود قطب ابدال	اور انہوں نے اپنے والد قطب ابدال
مرشد معنوی این فقیر حضرت شیخ احمد	مرشد معنوی حضرت شیخ احمد عبدالحق
عبدالحق قدس سرہ ۔۔۔۔۔	ردولوی سے فیض حاصل کیا۔
و بحب باطن این نیاز مند اویسی	اور باطنی محبت کے اعتبار سے میں
ست کہ از ابتدائے سلوک تا این زمان	اویسی ہوں کہ اس راہ سلوک کی ابتدائی
ارادت و تربیت و نوازش و نظر قبول	منزل سے اب تک میری عقیدت و
بفرزندی از روحانیت پاک معین الحق	تربیت فرزندانہ حضرت معین الدین

والدین چشتی قدس سرہ یافتہ ۔	چشتی قدس سرہ سے ہے،

پیش نظر نسخہ کتب خانہ النوریہ تکیہ شریف کاظمیہ کی ملکیت ہے، ۳۴۸ صفحات کا ہے جس میں مقدمہ اور فہرست کے صفحات بھی شامل ہیں، کاغذ بادامی اور مضبوط ہے، ہر صفحہ پر تیرہ[۱۳] سطریں ہیں، جلی قلم کی صاف لکھاوٹ ہے۔ کتابت کے موقع پر جہاں کہیں غلط ہو گیا ہے، وہیں حاشیہ پر صحت کر دی ہے۔ میں جناب شاہ مصطفٰی حیدر صاحب سجادہ نشیں آستانہ کاظمیہ کا مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ کتاب مجھ کو متعدد مرتبہ پڑھنے کو دی۔

مصنف نے سنہ ۱۰۴۵ھ میں اس کی تصنیف کا آغاز کیا ہے، لکھتے ہیں:

"در سنہ یک ہزار چہل و پنج[۱۰۴۵] بحکم باطن حضرت خواجہ معین الدین چشتی زمانۂ سلطنت بادشاہ شاہجہاں خلد اللہ ملکہ ابن نور الدین جہانگیر، میں نے اس کتاب کا نام مرأۃ الاسرار رکھا"

کتاب کی ابتدا ذیل کے الفاظ میں ہے:

"الحمد للہ رب المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد والہ واصحابہ اجمعین۔ قال اللہ تعالیٰ: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ یعنی بگو اے محمد اگر ہستید شما دوست دارندۂ خدا پس متابعت کنید مرا کہ دوست دارد خدائے شما پس آیۂ کریمہ متابعت آن سرور ظاہر باطن فرض شد۔ ظاہر متابعت مرتبہ نبوت و باطن متابعت ولایت"

دیباچہ میں بعد حمد و نعت کے نبوت اور مرتبۂ ولایت کا فرق ذیل کے الفاظ میں ہے:

"در اصطلاح صوفیہ ناجیہ مرتبۂ نبوت آنست کہ حضرت رسالت پناہ بواسطۂ جبرئیل فیض احکام شرائع آنکہ عالم میگرفت و بخلق میرساند۔	صوفیوں کی اصطلاح میں مرتبۂ نبوت وہ ہے کہ حضرت رسالت پناہ نے حضرت جبرئیل کی معرفت شریعت کے احکام وصول کر کے عوام الناس تک پہونچائے۔
و مرتبۂ ولایت آنکہ در مقام لی مع اللہ بواسطۂ جبرئیل فیض آثار و اسرار توحید از حق سبحانہ و تعالیٰ اخذ نمود۔ الولایۃ افضل من النبوۃ	مرتبۂ ولایت وہ ہے کہ بغیر حضرت جبرئیل کے واسطہ کے دل کو خدا سے لگا کر رابطہ قائم کر کے توحید کے رازوں کو سمجھائے، اسی لئے کہا گیا ہے، کہ ولایت کا مرتبہ نبوت سے افضل ہے[۱]۔

آگے چل کر ہدایت کرتے ہیں کہ طالب راہ سلوک کو چاہئے کہ اقوال و احوال عقاید صوفیہ کو اچھی طرح سمجھے اور صوفیائے کرام کے قدم بقدم صراط مستقیم (سیدھی راہ) پر چلے۔

صراط مستقیم کی تفصیل میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی "فتوحات مکی" اور حضرت شیخ علاؤ الدین سمنانیؒ کی کتاب "عروۃ الوثقی" کے چھٹے باب کا حوالہ دے کر بحث کی ہے۔

تقریباً دس صفحات کی یہ بحث چھیڑ کر ثابت کیا ہے کہ اہل دل و اہل صدق کا صحیح راستہ صراط مستقیم وہی ہے جس پر ان کے پیر اور دوسرے اولیاء اللہ نے عمل کر کے دکھایا اور فیض اٹھائے۔

صفحہ ۳۹ پر لکھتے ہیں کہ اس سفر سلوک کے زمانہ میں حالات دریافت کرنے کے خاطر میں نے بڑی ریاضتیں کیں، لیکن دل کی آرزو کی گرہیں نہیں کھلیں، اتفاقاً اسی زمانہ میں سنہ ۱۰۳۰ ہجری (زمانۂ سلطنت جہانگیر) میں مجھے تذکرۃ الاولیاء دیکھنے کو ملی، میں نے اس کو حرف بحرف پڑھا جب حضرت خواجہ بایزید بسطامی قدس سرہ کے حال پر پہونچا جس حالت کا مشتاق تھا مجھ پر منکشف ہو گئی۔

---

[۱] معارف:- اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا،

اسی زمانہ میں میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ احوال واقوال شجرۂ خواجگان چشت قدس اللہ اسرارہم کو معتبر کتابوں سے انتخاب کرکے لکھوں، اور دوسرے معاصر مشائخ کا ذکر بھی اس میں شامل کردوں، لیکن جو وقت جس کام کے لئے مقرر ہوتا ہے، اسی وقت پر ہوتا ہے۔ سنہ ایک ہزار پینتالیس (۱۰۴۵ھ) میں بحکم باطن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (زمانہ سلطنت بادشاہ شاہجہاں خلد اللہ ملکہٗ بن نور الدین جہانگیر میں) میں نے اس کتاب کا نام مرآۃ الاسرار رکھا۔

باوجود اپنی کم علمی اور عبارت آرائی کی بے بسی کے میں نے چند کلمات لکھنے کی کوشش کی، کیا کروں ان حضرات کی دوستی میں بے اختیار ہوں۔ من احبّ شیئاً اکثر ذکرہٗ کے مطابق میں نے معتبر کتابوں سے حالات لکھے ہیں۔

کتب معتبرہ اور متعددہ یعنی جن کتابوں کی مدد سے مصنف مرآۃ الاسرار نے فائدہ اٹھایا ہے، اور جگہ جگہ حوالے دیئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل ہیں:-

(۱) جواہر التفسیر (۲) تفسیر حسینی (۳) شرح مشکوٰۃ چنانچہ (۴) روضۃ الاحباب (۵) کشف المحجوب (۶) انیس الارواح (۷) دلیل العارفین (۸) فوائد السالکین (۹) راحت القلوب (۱۰) افضل الفواد (۱۱) فوائد الفواد (۱۲) سیر الاولیاء (۱۳) بحر المعانی (۱۴) معدن المعانی (۱۵) شرح آداب المریدین (۱۶) صفات العارفین (۱۷) تکملہ غوث الصمدانی (۱۸) فتوحات مکی (۱۹) فصوص الحکم (۲۰) ترجمۃ العوارف (۲۱) کلمات الصدیقین (۲۲) مناقب الاولیاء (۲۳) مناقب الاصفیاء (۲۴) لطائف اشرفی (۲۵) تذکرۃ الاولیاء (۲۶) جامع علوم (۲۷) خزانۂ جلالی (۲۸) مرآۃ العارفین (۲۹) تاریخ نافعی جس کو روضۃ الجنان کہتے ہیں۔ (۳۰) روضۃ الریاحین (۳۱) عروۃ الوثقیٰ

(۳۲) چہل مجلس شیخ علاء الدولہ (۳۳) فصل الخطاب (۳۴) شواہد النبوت (۳۵) نفحات (۳۶) رشحات (۳۷) روضۃ الصفا (۳۸) حبیب السیر (۳۹) روضۃ الشہداء (۴۰) سیر العارفین (۴۱) اخبار الاخیار (۴۲) لطائف صوفیہ (۴۳) تاریخ فیروز شاہی تصنیف ضیاء برنی (۴۴) تاریخ مرآۃ سکندری (۴۵) تاریخ نظامی (۴۶) منتخب التواریخ (۴۷) ملفوظ شیخ ماہی کنتوری (۴۸) ملفوظ شیخ احمد عبدالحق وغیرہ سے انتخاب کرکے مکمل کیا ہے۔ اور دعا کی ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ خواجگان چشت قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے فیض باطن سے ہر سہو وخطا سے محفوظ رکھے، اور اس بیچارے مصنف پر فیض باطن کی بارش کرکے کتاب کو قبولیت عطا فرمائے۔

صفحہ ۳۵ سے صفحہ ۳۷ تک مصنف نے اپنا مشرب بھی ذیل کے الفاظ میں لکھ دیا ہے:

"ہر چند اس فقیر نے دوسرے سلسلوں سے فیض اٹھایا ہے، جس کی تفصیل میں طوالت ہوگی، لیکن یہ خاکسار بندۂ خاندان چشت ودودمان اہل بہشت کی خاک سے فیض یاب ہے۔ اس نیاز مند نے ظاہری طریقہ پر صوفیہ ناجیہ کے مشرب میں قطب الوقت حضرت شیخ حمید قدس سرہ (متوفی ۲ جمادی الاول ۱۰۳۲ھ زمانہ بادشاہ جہانگیر) سے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے والد شیخ بدھ سے، انہوں نے اپنے والد حضرت شیخ محمد سے، انہوں نے اپنے والد حضرت شیخ عارف قدس سرہٗ سے، انہوں نے اپنے والد حضرت قطب ابدال مرشد معنوی این فقیر حضرت شیخ احمد عبدالحق قدس سرہٗ سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت بندگی جلال الحق والدین پانی پتی سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابر قدس سرہٗ سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت گنج شکر مسعود اجودھنی سے، انہوں نے اپنے پیر حضرت قطب الدین

بختیار کاکی اوشی سے، انہوں نے اپنے پیر قطب وحدت مقرب الحضرت محبوب رب العالمین خواجہ بزرگ حضرت معین الحق والدین چشتی سے، اور اسی طرح آخر میں حضرت علی مرتضیٰ رضی سے حضرت رحمۃ للعالمین صلعم تک پہونچتا ہے"

اس کے علاوہ جن جن بزرگوں سے ملے ہیں، اور فیض حاصل کیا ہے ان کا تذکرہ پوری کتاب میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ کہیں مزار پر حاضر ہو کر فیض یاب ہوئے اور کبھی ملاقات کر کے فیضیاب ہوئے ہیں۔

خاندانی شجرہ کے سلسلے میں طبقہ ۱۲ میں حالات شیخ دانیال عرف مولانا عود ذکر کرتے ہوئے مکمل چوبیس واسطوں سے حضرت علی مرتضیٰ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تک لکھا ہے۔

حقیر فقیر عبدالرحمن[1] چشتی بن عبدالرسول[2] بن قاسم[3] بن شاہ بدھ[4] عباسی العلوی بن میاں شیخ[5] ابن میاں دانیال[6] ثانی بن بدھ الدین[7] بن معین الدین[8] بن قطب[9] بن فرید[10] بن نظام[11] بن نصیر الدین[12] ابن دانیال عرف مولانا عود بن میر بدرالدین[13] بن حسن[14] بن فضل[15] بن عبداللہ[16] بن عباس ثانی[17] بن یحییٰ[18] ابن فضل ثانی[19] بن محمد[20] بن حسن[21] بن عبیداللہ[22] بن عباس[23] بن علی مرتضیٰ[24] بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ تک لکھا ہے۔ اس کی سند کے لئے لکھتے ہیں کہ "ما از آباؤ اجداد خود متواتر بنقل معتبر چنیں رسیدہ است"۔

اس شجرہ کی بارہویں پشت میں ایک بزرگ شیخ دانیال عرف مولانا عود ہوئے ہیں، ان کے مفصل حالات مراۃ الاسرار کے بست و یکم (اکیسویں) طبقہ میں اس طرح بیان کئے ہیں:

مولوی بدرالدین پدر مولانا عود بادشاہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ولایت خراسان سے ہندوستان آئے۔ ایک مدت تک "در لباس اغنیا" گذر کی۔ اس کے بعد جذبۂ حق نے زور کیا اور جو کچھ تھا سب چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ اور قصبہ ستر کھ میں گوشۂ تنہائی اختیار کیا، وہیں انتقال کیا، وہیں دفن ہوئے۔ ان کے اکلوتے بیٹے شیخ دانیال عرف مولانا عود بن میر بدرالدین اپنی والدہ کو ستر کھ میں چھوڑ کر تحصیل علوم کی خاطر بیانہ چلے گئے، جہاں قاضی عبداللہ سے علوم عقلی و نقلی حاصل کئے۔

قاضی صاحب نے اچھا حسب و نسب دیکھ کر اپنی صاحبزادی سے عقد کر دیا۔ شیخ دانیال مرشد کامل کی تلاش میں وہاں سے دہلی آئے، اور مشرق و مغرب کے دلوں کے بادشاہ شیخ نصیرالدین محمود کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی خدمت میں عرصہ تک تربیت حاصل کی، یہاں تک کہ خرقۂ خلافت سے فیض یاب ہوئے۔ چونکہ شیخ نصیرالدین محمود ان کو اکثر اوقات مولانا عود کے نام سے یاد کرتے تھے، اس وجہ سے اسی لقب سے مشہور ہو گئے، بہت سے لوگ ان کا اصلی نام نہیں جانتے۔ آنحضرت سے اجازت لے کر قصبہ بیانہ سے اپنے بال بچوں کو لے کر وطن روانہ ہوئے۔ سامان کئی اونٹوں پر بار تھا، ڈاکوؤں نے پیچھا کیا اور شیخ دانیال کو لکھنؤ سے گزرنے کے بعد راستہ میں شہید کر دیا۔ خادم جنازہ قصبہ ستر کھ میں لائے، اور ماں کے مزار کے مشرق جانب دفن کئے گئے۔ ان کے ایک لڑکے شیخ نصیرالدین بن شیخ دانیال ہوئے۔ ان کی کافی اولاد ہوئی، اور قصبہ ستر کھ میں آباد ہوئے۔ سلطان بہلول لودی کے زمانہ میں خوشحالی نصیب ہوئی، بادشاہ کی طرف سے جائدادیں عنایت ہوئیں، جائداد کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں امیٹھی میں قیام اختیار کیا۔ ان کی قبر بھی اسی قصبہ میں ہے۔ ان کے ایک صاحبزادے شیخ بدھ تھے، جو صاحب دولت ہونے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ روزگار، صاحب طریقت و خلافت تھے، مخدوم شیخ خاصہ بن خضر چشتی رح کے خلیفہ بھی تھے۔ ان کا مزار بھی قصبہ امیٹھی میں ہے۔ شیخ داؤد پسر کلاں شیخ بدھ بڑے صاحب وقار تھے، اور شیخ بدھ کے سامنے وفات پا گئے۔ شیخ گوہر بن داؤد اکبر بادشاہ کے وقت میں قاضی جونپور تھے، غرض میرے والد شیخ عبدالرسول بن قاسم بن شاہ بدھ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں ۱۰۰۲ھ میں قصبہ امیٹھی سے بانگر مئو چلے آئے، اور وہاں موضع رسول پور عرف دھنیتی من اعمال پرگنہ لکھنؤ رہنے لگے۔ (یہ مقام اب تیر گاؤں کہلاتا ہے)

اس فقیر کاتب حروف کی ولادت صبح پنجشنبہ ۹ ربیع الآخر ۱۰۰۵ھ ہجری اکبر بادشاہ کے زمانہ میں اسی قصبہ میں ہوئی، چار سال کی عمر میں شیخ محمد بندگی شیخ نظام الدین امیٹھوی نے

بسم اللہ کی رسم ادا کرائی، اور چند سال آداب امر و نہی سیکھنے میں گذر گئے، بعد کو اپنے والد کے ساتھ طلب معاش میں لگ گیا۔ انیس[19] سال کی عمر میں سلطنت جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں عشق مجازی کے ذریعہ طلب حق پیدا ہوئی، چند سال اغنیا کی صورت میں ریاضات، مجاہدات شاقہ اور ہر سلسلے کے عملیات کئے، اور بطرز اویسی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عقیدت پیدا ہوئی، اور ان کی روحانیت پاک سے فیض حاصل کیا۔

اپنی والدہ کے سلسلۂ نسب کا بھی تذکرہ میر سید کمال ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سید علیم الدین قنوجی کے فرزند سید شہاب الدین کی اولاد میں تھیں، ص ۳۴۵ پر ان کا شجرہ تفصیل سے دیا ہے۔

ایک جگہ صفحہ ۳۹ پر لکھتے ہیں:

"اس سیر و سلوک کے دوران (سنہ ۱۰۳۰ھ سلطان جہانگیر کے زمانہ میں) مجھے تذکرۃ الاولیا، کتاب مل گئی، میں نے اس کا حرف بحرف مطالعہ کیا، جب حضرت خواجہ بایزید کے حالات پر پہونچا جس حالت کا مشتاق تھا مجھ پر منکشف ہو گئی، (۳) [illegible] میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ خواجگان چشت کے حالات لکھنا چاہئے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "مرآۃ مسعودی (حالات سید سالار مسعود غازیؒ) جو سنہ ۱۰۴۵ھ اور سنہ ۱۰۵۵ھ کے درمیان لکھی گئی۔ اس کے لکھنے کے دوران ان کو حضرت سید سالار مسعود غازیؒ (بہرائچ) کی محبت حقیقی کا غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔" حضرت خواجہ احمد جامی اور خواجہ بہاءالدین نقشبند کے حالات میں لکھتے ہیں کہ

"آج جب کہ سنہ ایک ہزار پنجاہ و ہفت (۱۰۵۷) ہجری ہے، میں لکھتا ہوں کہ ستائیس سال پہلے اس نیاز مند کو روحانیت سید الشہداء سے لگاؤ پیدا ہو گیا

تھا۔ اس درمیان ظاہر و باطن میں کوئی بھی واقعہ ایسا نہیں گذرا کہ جس میں روحانیت سید الشہداء نے مجھے خبردار نہ کیا ہو، اور امداد صوری و معنوی نہ عطا فرمائی ہو"

کتاب کے آخر میں دوبارہ اجمیر میں حاضر ہو کر کتاب کے خاتمہ کے سلسلے میں مراقبہ کیا، تو معلوم ہوا کہ اویسی رہنما خواجہ معین الدین چشتیؒ نے چار بزرگوں کے سپرد کر دیا ہے، وہ ان کی رہنمائی اور حفاظت کریں گے۔

(۱) مشرق میں حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کچھوچھہ شریف (۲) مغرب میں حضرت شیخ بدیع الدین مدارؒ مکن پور (۳) شمال میں سید سالار مسعود غازیؒ (بہرائچ) اور (۴) جنوب میں حضرت شیخ حسام الدین مانکپوریؒ

غرض جہاں جہاں عشق حقیقی نے رہنمائی کر کے فیض سے مالامال ہونے کا موقع دیا وہیں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر اپنی کامیابی کا اقرار کیا ہے۔

مذکورہ بالا چاروں رہنماؤں میں سے دو پر تو انہوں نے علیحدہ علیحدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔

(۱) مرآۃ مسعودی۔ سید سالار مسعود غازی کے حال ہیں۔ اور مرآۃ مداری حضرت بدیع الدین مدار کے حالات ہیں۔

باقی دو پر مرآۃ الاسرار میں عقیدت کے پھول بکھیرے ہیں، اور اپنی وابستگی کا اقرار کیا ہے۔

ص ۴۴ پر مرآۃ الاسرار کی ترتیب کی وضاحت ذیل کے الفاظ میں کی ہے:

ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب میں علاوہ مقدمہ اور خاتمہ کے انتیس[29] طبقے قائم کئے گئے ہیں، ہر طبقہ میں تقریباً ایک مسلک کے اولیاء اللہ کے حالات ہیں۔ ان حالات کے ساتھ بعض جگہوں پر کسی بزرگ کے حالات میں بعض دوسرے بزرگوں کا حال تفصیل سے آ گیا ہے۔ حالات لکھتے وقت

برابر کتابوں اور مصنفین کے حوالے دیتے جاتے ہیں۔ کتاب کی زبان بھی پاک و صاف، سلیس و رواں ہے کہ پڑھتے ہی رہنے کا جی چاہتا ہے۔

مقدمہ میں خرقۂ خلافت الٰہی، چار پیر و چودہ ۱۴ خانوادوں اور دوسرے خاص خاص گھرانوں کا ذکر ہے، جو ان چودہ ۱۴ خانوادوں سے نکلے ہیں۔ رجال اللہ، غوث و قطب و خضر و الیاس علیہم السلام کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے، عوامی عقیدہ کہ خضر علیہ السلام سکندر رومی کے زمانہ میں تھے اور اس کے ساتھ ظلمات کے سفر کو گئے، وہاں آبِ حیات نوش کیا، جس سے حیاتِ جاوداں ملی، کو قرآن شریف، تفاسیر، اور تاریخی حوالوں سے غلط ثابت کیا ہے، بہت سے بزرگوں کی ملاقات کے حوالے دے کر اپنی قربت اور عقیدت کا اظہار کرکے فیض یابی کا تذکرہ کرتے جاتے ہیں۔

"اس فقیر کاتب الحروف نے چند مرتبہ خضر علیہ السلام کو مع دیگر مردانِ غیب و شہداء کے دیکھا ہے، اور استفادہ صوری و معنوی ان کی ذات بابرکات سے حاصل کیا ہے۔"

حاشیہ پنجم - جو شاہ جہاں بادشاہ کے حالات میں ہے، ص ۳۰۱۶ پر لکھتے ہیں:

"ایں فقیر کاتب حروف از شیخ حاتم سند یافتہ است و شیخ صوفی را نیز فقیر بارہا دیدہ است از جمال رحمۃ اللہ علیہ بہر حال چند روز کہ فقیر بود ہر روز میدید کہ شیخ صوفی اول نزد شاہجہاں رفتہ تاریخ طبقات ناصری ورد، آخر روز یک مکتوب حضرت شیخ شرف الدین منیری تعلیم می نمود و دریں ضمن از حالات تفاسیر و احادیث و اصطلاح صوفیہ و قواعد شاہزادہ را مستفید می گردانید و از مذہب اہل سنت و جماعت کہ فقط متابعت بر نصوص است و جمیع صوفیہ اہل صفا بر آں نیز بوجہ احسن آگاہ ساخت۔"

غرض ہر جگہ ان کے مطالعہ کی وسعت اور سچی لگن کا پتہ چلتا ہے۔ اس لگن میں انہوں نے

متعدد سفر بھی کئے ہیں، اور ان سے حاصل شدہ فوائد کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔

ص ۷۷ پر خانوادوں کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خرقۂ خلافت چار بزرگوں کو پہونچا جن کو چار پیر کہتے ہیں، اول حضرت امام حسن علیہ السلام، دوم حضرت امام حسین علیہ السلام، سوم حضرت خواجہ کمیل زیاد رح، چہارم حضرت خواجہ حسن بصری رح۔

اس کے بعد چودہ ۱۴ خانوادوں کا ذکر ہے جو ذیل کے بزرگوں کے مسلک سے شائع ہوئے۔

(۱) خانوادۂ زیدیان | جو خواجہ عبد الواحد بن زید سے منسوب ہے، جو حضرت خواجہ حسن بصری کے مرید و خلیفہ تھے، یہ لوگ ہمیشہ بیابان میں خلوت اختیار کرتے، اور مجاہدہ کرتے ہیں۔ تین چار روز کے بعد میوہ یا جنگلی گھانس سے افطار کرتے ہیں۔ شہر اور قصبات میں نہیں جاتے، کسی جاندار کو نہیں مارتے، اور نہ کسی سے "فتوح" لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت خواجہ فضیل بن عیاض رح و حضرت خواجہ کمیل زیاد سے زیادہ بڑھا۔

(۲) خانوادۂ عیاضیان | حضرت خواجہ فضیل بن عیاض خلیفہ عبد الواحد زید سے نسبت رکھتا ہے۔ عیاضیان ہمیشہ مسافر و تنہا و مجرد رہتے ہیں، گھر بار کچھ نہیں رکھتے۔ نیا کپڑا نہیں پہنتے۔ کسی سے سوال نہیں کرتے، جو کچھ ان کو بغیر طلب کے غیب سے ملتا ہے خرچ کرتے ہیں، اور کھانا مہمان کے ساتھ کھاتے ہیں۔

(۳) خانوادۂ ادھمیان | یہ خانوادہ حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھم سے نسبت رکھتا ہے، ان کو تین بزرگوں حضرت خضر علیہ السلام و حضرت فضیل بن عیاض و حضرت امام محمد باقر سے فیض ملا ہے، ادھمیان مجرد اور مسافر رہتے ہیں، ذکر جلی زیادہ کرتے ہیں، بے سوال جو غیب سے پاتے ہیں، اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ مجاہدہ اور ریاضت کرتے رہتے ہیں۔

(۴) خانوادۂ ہبیریاں | حضرت خواجہ ہبیرہ بصریؒ سے منسوب ہے۔ خلیفہ حضرت حذیفہ مرعشی خلیفہ حضرت ابراہیم ادہمؒ تا حضرت خواجہ بصریؒ۔ یہ لوگ شہر و قریہ میں نہیں رہتے۔ دن رات باوضو بیابان میں رہتے ہیں۔ حضوری دل سے نماز ادا کرتے ہیں۔ خلق سے دور بھاگتے ہیں، کسی سے کوئی فتوح نہیں لیتے۔ تین چار روز کے بعد میوہ اور گھانس سے افطار کرتے ہیں۔ ہمیشہ دل کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۵) خانوادۂ چشتیاں | حضرت خواجہ دینوریؒ سے منسوب ہے۔ جو مرید و خلیفہ حضرت خواجہ ہبیرہ بصریؒ کے تھے۔ یہ سب صاحب ریاضت اور صاحب سماع و ذوق ہوتے ہیں، شہر اور قریہ میں اپنا مسکن بناتے ہیں، اور ہر ایک فرقے سے تواضع سے پیش آتے ہیں۔ ان کی دو صفتیں ہوتی ہیں، ایک ترک و ایثار، دوم عشق و انکسار، چونکہ اس کے اولین بزرگ حضرت ابو اسحٰق شامیؒ ہیں جن کو اجازت و خلافت دے کر چشت کی طرف بھیجا گیا تھا اس لئے چشتیہ کہلاتا ہے۔

(۶) خانوادۂ عجمیاں | حضرت خواجہ حبیب عجمی سے نسبت ہے، جو مرید و خلیفہ خواجہ حسن بصریؒ کے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پہاڑوں پر سکونت رکھتے ہیں۔ فتوح قبول نہیں کرتے۔ کپڑے ستر عورت کے مطابق پہنتے ہیں،

(۷) خانوادۂ طیفوریان | اس سلسلہ کا تعلق حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ سے ہے، نام ان کا طیفور ہے جو خلیفہ تھے حضرت امام جعفر صادقؒ کے، اور حضرت حبیب عجمی سے بھی خرقہ پایا تھا۔

(۸) خانوادۂ کرخیاں | اس کی نسبت حضرت معروف کرخیؒ سے ہے، جو خلیفہ ہیں حضرت امام علی رضاؓ کے اور حضرت خواجہ داؤد طائیؒ سے بھی خرقہ پایا تھا۔ ان کے ماننے والے قرآن شریف بہت پڑھتے ہیں، اور اللہ کے ڈر سے بہت روتے ہیں۔ اور اپنے کو سب سے کمتر جانتے ہیں، ذکر بہت کرتے ہیں۔ کرخ بغداد کے پاس موضع ہے۔

(۹) خانوادۂ سقطیان | یہ سلسلہ حضرت خواجہ سری سقطیؒ مرید و خلیفہ حضرت معروف کرخیؒ سے ہے، یہ لوگ صائم الدہر اور قائم اللیل ہوتے ہیں، کسی سے کچھ قبول نہیں کرتے، ایک ساتھ یاروں کے ساتھ

کر افطار کرتے ہیں۔ تین دن بعد خلوت سے باہر آتے ہیں۔

(۱۰) خانوادۂ جنیدیاں | اس سلسلہ کو نسبت ہے حضرت جنید بغدادیؒ سے جو مرید و خلیفہ تھے حضرت خواجہ سری سقطیؒ کے۔ یہ لوگ توکل پر زندگی گزارتے ہیں، اور مجاہدات و عبادات بہت کرتے ہیں، اور جو کچھ بغیر کسی سبب کے ملتا ہے، اس سے افطار کرتے ہیں۔

(۱۱) خانوادۂ گازرونیاں | اس کو حضرت خواجہ ابو اسحٰق گازرونیؒ سے نسبت ہے، یہ گازرون کے امیر تھے، جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ ابو عبد اللہ خفیف کے۔ ان کے ماننے والے خلق کے درمیان رہ کر حق کی یاد کرتے ہیں۔ اسمائے اعظم اور بانت القدر بہت پڑھتے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ "خواجہ فرمود کہ ہم ترا دنیا و ہم ترا دین" یہ خواجہ محمد رویمؒ کے واسطہ سے حضرت جنیدؒ تک پہونچتا ہے۔

(۱۲) خانوادۂ طوسیان | اس کو شیخ علاء الدین طوسی سے نسبت ہے، جو خلیفہ و مرید ہیں خواجہ وجیہ الدین ابو حفص کے۔ طوسیوں اور فردوسیوں کی ایک روش ہے، سماع سے ذوق رکھتے ہیں، مزامیر سنتے ہیں، رقص و تواجد کرتے ہیں۔ ذکر جلی کے بہت شائق ہوتے ہیں، جہاں پہونچتے ہیں جو ملتا ہے کھاتے ہیں، جو کچھ ہوتا ہے وہ مومن، کافر، فقیر و غنی سب کو برابر تقسیم کرتے ہیں، ریاضات بہت کرتے ہیں، ان کا سلسلہ چھ واسطوں سے حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے۔

(۱۳) خانوادۂ سہروردیاں | یہ شیخ ضیاء الدین ابو النجیب سہروردیؒ سے تعلق رکھتا ہے، جو مرید و خلیفہ ہیں شیخ وجیہ الدین ابو حفصؒ کے۔ یہ سلسلہ چھ واسطے سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کے لوگ دوسرے سلسلہ سے متعلق کم دیکھے جاتے ہیں۔

(۱۴) خانوادۂ فردوسیاں | اس سلسلہ کا تعلق شیخ نجم الدین کبریؒ سے بتاتے ہیں، جو مرید و خلیفہ تھے حضرت ابو النجیب سہروردی کے جو اکابر فردوس سے تھے، یہ سلسلہ چھ واسطوں سے حضرت جنید

بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، حضرت کمیل بن زیادؒ سے بھی خرقہ پایا ہے۔

اس کے علاوہ چالیس[40] خانوادوں کو اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ وہ سب ان ہی چودہ[14] خانوادوں سے نکلے ہیں، ان کا تذکرہ اس مختصر میں تفصیل سے نہیں کیا جاسکتا، البتہ ان بارہ[12] خانوادوں کا حال جو مشہور ہیں، اجمال کے طور پر حاضر خدمت ہے۔

(۱) خانوادۂ قادریہ غوثیہ۔ حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ سے اس سلسلہ کی ابتدا ہوتی ہے، جو مرید و خلیفہ تھے شیخ ابو سعید مخزومیؒ کے اور وہ مرید و خلیفہ تھے شیخ ابوالحسن علی القرشیؒ کے اور وہ شیخ ابوالفرج یوسف طرطوسیؒ کے اور وہ مرید تھے شیخ عبدالواحد تمیمیؒ کے اور وہ شیخ ابوبکر شبلیؒ کے اور وہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ کے۔

(۲) خانوادۂ یسویہ۔ حضرت خواجہ احمد یسویؒ سے تعلق رکھتا ہے، جو ترکستان کے صاحب ارشاد تھے، اور مرید و خلیفہ تھے خواجہ یوسف ہمدانی کے، سلسلہ ان کا حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ کے ذریعہ حضرت محمد بن حنفیہ بن علیؓ سے ملتا ہے۔ ایک عالم ان کے فیض سے منوّر ہوا۔

(۳) خانوادۂ نقشبندیہ۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند سے تعلق رکھتا ہے، جو مرید و خلیفہ تھے امیر سید کلال کے۔ خواجہ بہاء الدینؒ کو ظاہر و باطن کے آراستہ کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ذرا ہی توجہ میں زندگی سنوار دیتے تھے۔

(۴) خانوادۂ نوریہ اس خانوادہ کے روح رواں شیخ ابوالحسن نوری تھے، جن کا نام احمد بن محمد تھا، ان کو خرقہ و خلافت حضرت خواجہ سری سقطیؒ سے ملی، ان کو طریق ارشاد میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔

(۵) خانوادۂ خضرویہ۔ اس سلسلہ کی ابتدا حضرت خواجہ احمد خضرویہ سے ہے، جو مریدوں کی تربیت میں بلند ہمت کے مالک تھے۔ مرید و خلیفہ تھے حضرت حاتم الاصمؒ کے۔ اہل تصوف کے نزدیک بڑے بلند ہمت اور قوی حال کے مالک تھے، اور مریدوں کی تربیت میں بڑے چوکس۔

(۶) خانوادۂ شطاریہ عشقیہ۔ ہندوستان میں اس کے بانی مبانی شیخ عبداللہ شطاریؒ ہیں، جن کا نعرہ تھا کہ جو خدا کا طالب ہو، آئے، میں خدا تک پہونچادوں۔ اس سلسلہ کے اکثر لوگ جونپور کے علاقہ میں بابرکت اور بزرگ شخصیت کے مالک ہیں۔

(۷) خانوادۂ حسینیہ بخاریہ۔ یہ سلسلہ خاندان سادات سے متعلق ہے۔ لطائف اشرفی کے حوالے سے اس سلسلہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ یہ ہندوستان میں حضرات سادات سے ہوتا ہوا حضرت مخدوم جہانیاں بخاری تک پہونچتا ہے۔

(۸) خانوادۂ زاہدیہ۔ اس کی ابتدا خواجہ بدرالدین زاہدؒ سے ہوئی۔ جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ فخرالدین زاہد کے، اس طرح دس[10] واسطوں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ہندوستان میں جونپور کے علاقہ میں زیادہ ہوئی۔

(۹) خانوادۂ انصاریہ۔ اس کا تعلق خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات سے ہے۔ جو مرید و خلیفہ تھے خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے، ان کا تعلق سات واسطوں سے سید الطائفہ خواجہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت خراسان اور ہرات میں ہوئی۔

(۱۰) خانوادۂ صفویہ۔ اس سلسلہ کے بانی مبانی شیخ صفی الدین بن اسحٰق اردبیلی ہیں، اس کا تعلق آٹھ واسطوں سے سید الطائفہ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ کی اشاعت ملک عراق اور خراسان میں ہوئی، یہ مرید و خلیفہ و داماد تھے شیخ زاہد گیلانی کے، ان سے بڑی تعداد میں لوگوں نے فیض اٹھایا۔

(۱۱) خانوادۂ عیدروسیہ۔ اس کا تعلق میر سید عبداللہ مکی سے ہے، جو آٹھ واسطوں سے حضرت سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے، اس سلسلہ نے عرب و عدن، گجرات و احمد آباد میں اشاعت پائی، ان کی ذات بڑی بابرکت اور عدیم المثال تھی، ان سے بڑے خوارق و عادات ظہور میں آئے۔

(۱۲) خانوادۂ قلندریہ۔ ہندوستان میں مشرب قلندریہ حضرت سعدی کے ذریعہ پھیلا، وہ سلطان

شمس الدین التمش کے زمانہ میں حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں
میں پہونچے، جونپور، الٰہ آباد، لکھنؤ، پانی پت وغیرہ کے اطراف میں اس کی خوب اشاعت ہوئی۔

اس کے بعد کتاب بحر المعانی کے حوالہ سے اقطاب، غوث، امامان، اوتاد، ابدال، اخیار، ابرار، نقبا، نجبا، عمدہ، مکتوفان، مفردان کے مقامات اور ان کی پہچان بتائی ہے۔

قطب عالم کو قطب ارشاد و قطب الاقطاب اور قطب مدار بھی کہتے ہیں۔ موجودات سفلی اور علوی اسی کے وجود کی برکت سے ہوتے ہیں، قطب مدار کے دو وزیر بھی ہوتے ہیں۔ "فتوحات مکی" میں ان کو امامان کے نام سے یاد کیا ہے، ان میں سے ایک داہنی طرف اور دوسرا بائیں طرف رہتا ہے، داہنی طرف رہنے والے کا نام عبد الملک ہے، یہ قطب مدار کی روح سے فیض حاصل کرتا ہے، اور اہل علوی پر فیض جاری کرتا ہے۔ بائیں جانب رہنے والے کا نام عبد الرب ہے، یہ قطب مدار کے دل سے فیض یاب ہوتا ہے، اور اہل سفلی پر فیض جاری کرتا ہے، جب قطب مدار اس دنیا سے رحلت کرتا ہے، تو عبد الملک نامی وزیر قطب مدار کا قائم مقام ہو جاتا ہے، اور قطبیت کے مقام پر فائز ہو کر دنیا میں عبد اللہ کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے، اسی طرح وزیر عبد الرب نامی کو عبد الملک کی جگہ ملتی ہے، اور قطب مدار کہلاتا ہے، اور دوسرے ابدال میں سے کوئی عبد الرب کی جگہ لے لیتا ہے، اسی طرح قیامت تک ہوتا رہے گا۔

قطب اول حضرت نوح علیہ السلام کے قلب سے متاثر ہوتا ہے، اور اس کا ورد سورہ یٰسین ہے، قطب دوم حضرت ابراہیم کے قلب سے متاثر ہوتا ہے، اس کا ورد سورہ اخلاص ہے، اسی طرح بارہوں قطب بارہ نبیوں کے قلوب سے علٰحدہ علٰحدہ فیض حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اے میرے پیارے میں ان سب مختلف مقامات پر قدم بوس ہوا ہوں، ان میں قطب اقلیم ہوتے ہیں جو ساتوں اقالیم میں پھیلے ہوئے ہیں، ہر اقلیم میں ایک قطب اور پانچ اقطاب ولایت ہوتے ہیں، قطب ولایت کے سایہ میں اولیاء رہتے ہیں۔ اے دوست جان لو کہ جب ولی ترقی کرتا ہے تو قطب ولایت ہوتا ہے۔

قطب ولایت ترقی کر کے قطب اقلیم ہو جاتا ہے۔ قطب اقلیم ترقی کر کے عبد الملک کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔

اس کے بعد قطب الارشاد اور قطب ابدال کا فرق واضح کیا ہے، اسی طرح اوتاد، نجبا اور دیگر اہل اللہ کے مقامات کی تفصیل بتائی ہے۔

اس کے بعد حضرات خضر و الیاس کا تذکرہ ہے۔ ان کے کام اور مقامات کی تفصیل دی ہے۔ اس کے بعد واصلان، کاملان، سالکان، مقیمان وغیرہ کے مقامات کی تفصیل بیان کی ہے۔

صفحات ۲۳۲ سے طبقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، کل ۲۹ طبقات قائم کئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

طبقۂ اول (پہلا طبقہ) دربیان مجمل از احوال حضرت رسالت پناہ صلعم وذکر خلفائے راشدین و عشرہ مبشرہ وغیرہ (ص ۲۳۲ سے ص ۲۵۹ تک)

ذکر حضرت رسالت پناہ صلعم، ذکر حضرت ابو بکر صدیق رض، ذکر حضرت عمر بن الخطاب رض، ذکر حضرت عثمان بن عفان رض، ذکر حضرات عشرہ مبشرہ رض

باقی اٹھائیس طبقوں میں دوسرے اولیاء اللہ کاملین و مکمل، صوفیائے کرام، فقرائے متقیہ اور ان مجذوب حضرات کے حالات ہیں جو صوفیائے کرام میں شمار ہوتے ہیں۔

اٹھائیس اسمائے الٰہی کا تذکرہ ہے جن سے صوفیائے کرام کے دلوں کو سکون و تقویت حاصل ہوتی ہے، اور فیض یاب ہوئے ہیں، ان اسمائے الٰہی میں ہر اسم کسی نہ کسی ولی اللہ کا مظہر اسم ذات ہے۔ اسکے علاوہ ایک حاشیہ ہے۔

طبقۂ دوم (دوسرا طبقہ) دربیان مجمل احوال حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ وذکر ائمہ معصومین وغیرہ (ص ۲۵۹ سے ص ۵۱۹ تک) اس میں بارہ ائمہ معصومین کا حال ہے۔

ذکر حضرت علی بن ابی طالب رض، ذکر حضرت امام حسن رض، ذکر حضرت امام حسین شہید کربلا، ذکر حضرت

امام زین العابدینؒ، ذکر حضرت امام باقرؒ، ذکر حضرت امام جعفر صادقؒ، ذکر حضرت امام موسیٰ کاظمؒ
ذکر حضرت امام موسیٰ رضاؒ، ذکر حضرت امام محمد تقیؒ، ذکر حضرت امام محمد نقیؒ، ذکر حضرت امام حسن عسکریؒ،
ذکر حضرت امام مہدیؒ۔

طبقۂ سوم (تیسرا طبقہ) دربیان مجمل از احوال خواجہ حسن بصریؒ و ذکر خواجہ کمیل ابن زیادؒ وغیرہ (ص ۵۱۹ سے ص ۵۶۶ تک) اس میں مندرجہ ذیل چھ بزرگوں کے حالات ہیں۔

ذکر حضرت خواجہ حسن بصریؒ، ذکر حضرت خواجہ کمیل بن زیادؒ، ذکر خواجہ یحییٰ مالک بن دینارؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد واسعؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو حازم مکیؒ، ذکر حضرت رابعہ بصریؒ۔

طبقۂ چہارم (چوتھا طبقہ) دربیان مجمل احوال حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ و ذکر حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ وغیرہ (ص ۵۶۶ سے ص ۵۹۵ تک) اس طبقہ میں کل چھ بزرگوں کا حال ہے۔

ذکر حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ، ذکر حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ، ذکر حضرت عتبہ بن غلامؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن حسنؒ، ذکر حضرت خواجہ فتح بن علی الموصلیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو ہاشم صوفیؒ۔

طبقۂ پنجم (پانچواں طبقہ) دربیان مجمل از احوال خواجہ فضیل بن عیاضؒ و ذکر سفیان ثوریؒ وغیرہ (ص ۵۹۶ سے ص ۶۶۲ تک) اس میں بارہ بزرگوں کا حال ہے:

ذکر حضرت فضیل بن عیاضؒ، ذکر حضرت سفیان ثوریؒ، ذکر حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ، ذکر حضرت امام شافعیؒ، ذکر حضرت امام ابن حنبلؒ، ذکر حضرت خواجہ داؤد بن نصیر طائیؒ، ذکر حضرت خواجہ بشر حافیؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن مبارکؒ، ذکر حضرت خواجہ داؤد بلخیؒ، ذکر حضرت خواجہ منصور عمارؒ، ذکر حضرت خواجہ حارث بن محاسبیؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد بن عاصمؒ۔

طبقۂ ششم (چھٹا طبقہ) (ص ۶۶۳ سے ص ۷۰۸ تک)، اس میں دس بزرگوں کا حال ہے، مجمل از احوال خواجہ ابراہیم ادہمؒ و ذکر خواجہ معروف کرخیؒ وغیرہ۔

ذکر حضرت خواجہ ابراہیم ادہمؒ، ذکر حضرت خواجہ معروف کرخیؒ، ذکر حضرت خواجہ ذوالنون مصریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو علی شقیقؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد بن خضرویہؒ، ذکر حضرت خواجہ ابراہیمؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن فضلؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد بن علی حکیم ترمذیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابوبکر وراقؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو علی جرجانیؒ۔

طبقۂ ہفتم (ساتواں طبقہ) مجمل از احوال خواجہ حذیفہ مرعشیؒ وغیرہ، ص ۷۰۹ سے شروع ہوتا ہے، اس میں مندرجہ ذیل گیارہ بزرگوں کے حالات ہیں:

ذکر حضرت خواجہ حذیفہ مرعشیؒ، ذکر حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ، ذکر حضرت خواجہ حاتم بن اصمؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو سلیمان دارانیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابراہیم صاد السعدادیؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد سماکؒ، ذکر حضرت خواجہ محمد بن اسلم طوسیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو تراب نخشبیؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد حواریؒ، ذکر حضرت خواجہ یوسف بن الحسینؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ محمد بن اسمٰعیل مغربیؒ۔

طبقۂ ہشتم (آٹھواں طبقہ) مجمل از احوال خواجہ ہبیرہ بصریؒ و خواجہ سری سقطیؒ وغیرہ (ص ۷۴۹ سے ص ۷۹۹ تک)، اس میں گیارہ بزرگوں کے حالات ہیں:

ذکر حضرت خواجہ حسن بصریؒ، ذکر حضرت خواجہ سری سقطیؒ، ذکر حضرت خواجہ یحییٰ معاذ رازیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو حفص حدادؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد حربؒ، ذکر حضرت خواجہ سہیل بن عبداللہ تستریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو حمزہ بغدادیؒ، ذکر حضرت خواجہ خیر نساجؒ، ذکر حضرت خواجہ سمنون محبؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو حمزہ خراسانیؒ، ذکر حضرت خواجہ شجاع کرمانیؒ۔ (باقی)

امام ابو ثورؒ

امام شافعیؒ کے ایک نامور شاگرد

از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

امام شافعیؒ کے مصری شاگردوں اور جدید فقہ شافعی کے آخری راویوں میں سے چار نمایاں ترین حضرات کا ذکر معارف کے گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، موجودہ فقہ شافعی کا زیادہ دارومدار انہی چار حضرات یعنی امام مزنی، امام مرادی، امام بویطی، اور امام یونس بن عبد الاعلی صدفی کی روایتوں پر ہے، تاہم فقہ شافعی کی ترویج و اشاعت میں امام شافعی کے بغدادی شاگردوں اور قدیم فقہ شافعی کے چار اور راویوں اور ناقلوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، یہ چار حضرات امام احمد بن حنبل[1]، امام زعفرانی، امام کرابیسی اور امام ابو ثور ہیں، ان بزرگوں کی اہمیت یوں اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ فقہ حنفی کے سب سے بڑے مرکز میں امام شافعیؒ کے مکتب فکر کے شارح اور مبلغ ثابت ہوئے۔

امام شافعیؒ پہلی بار ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے اور تقریباً دو سال یہاں قیام کیا، یہیں انھوں نے عبد الرحمن بن مہدی کی فرمایش پر اصول فقہ میں غالباً سب سے پہلی کتاب کتاب الرسالہ کو مدون کیا، اور یہیں ان کی مجلسوں میں علم حدیث و فقہ کی گرم بازاری رہی، بغداد کے دینی و علمی حلقوں کے بہترین افراد ان مجلسوں کی زینت بنے، امام احمد بن حنبل، امام

[1] امام احمد بن حنبل گو بعد میں ایک الگ مکتب فکر کے بانی ہوئے، لیکن فقہ شافعی کے قدیم رواۃ میں وہ بہرحال ممتاز ہیں،

زعفرانی، امام کرابیسی، قاسم بن سلام، ابو عبد الرحمن احمد بن محمد اشعری اور ابو یعقوب اسحق بن ابراہیم اور امام ابو ثور جیسے نامور اہل علم و فقہ ان علمی محفلوں کے مستقل حاضر باش تھے، اور در حقیقت فقہ شافعی کو اصل اہمیت یہیں ملی اور فقہ حنفی کے بعد اس کے دوسرے اہم مکتب فکر ہونے کی بنیاد یہیں پڑی، امام زعفرانی کے حالات میں اس پر روشنی ڈالی جاچکی ہے،

ان کے بعد دوسری اہم شخصیت امام ابو ثور کی ہے، ان کا ذکر گو طبقات و تراجم کی کتابوں میں انتہائی شاندار الفاظ میں ملتا ہے، مثلاً وہ فقہ، علم، ورع، فضل اور خیر میں ائمہ کی صف میں شمار ہوتے ہیں[1]، وہ الامام الجلیل ہیں[2]، لیکن افسوس ہے کہ ان کے حالات کی کما حقہ تفصیلات سے ان کتب کے صفحات کا دامن تنگ نظر آتا ہے، ان کی علمی و فقہی خدمات کا ذکر جس تفصیل سے ملنا چاہئے نہیں ملتا، اور اس طرح یہ آئینہ عدم توجہ اور امتداد زمانہ کے غبار سے دھندلا ہو کر رہ گیا ہے، پھر بھی ان کی شخصیت سے متعلق جس قدر ممکن معلومات فراہم ہو سکی ہیں وہ سطور ذیل میں پیش ہیں،

نام و نسب: نام ابراہیم بن خالد بن یمان کلبی ہے، ابو عبد اللہ کنیت اور لقب ابو ثور ہے اور اسی لقب نے شہرت دوام حاصل کی، تاریخ و مقام پیدایش کے بارہ میں تذکرہ نگار خاموش ہیں لیکن چونکہ ۲۴۰ھ میں وفات کے وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی اس لیے سال پیدایش ۱۷۰ھ کہا جا سکتا ہے، بغداد میں مستقل قیام و سکونت کی وجہ سے ظن غالب یہ ہے کہ بغداد ہی ان کی جاے پیدایش ہے۔

اساتذہ: امام ابو ثور نے جن حضرات سے کسب فیض کیا ان میں ابوسفیان بن عیینہ، ابن علیہ، عبیدہ بن حمید، ابو معاویہ، وکیع، معاذ بن معاذ، عبد الرحمن بن مہدی اور یزید بن ہارون جیسے

[1] سبکی طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۲۸ [2] نووی تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰

ائمہ کبار شامل ہیں[1]، اکتساب فیض کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب امام ابوثورؒ کے حسن ذوق
اور ابتدا سے ان کی خوب سے خوب تر کی جستجو کا ثبوت ہے۔

امام شافعیؒ سے تعلق | عراق اور خصوصاً بغداد میں فقہ حنفی کو رواج عام حاصل تھا، اس لیے
امام زعفرانی کی طرح امام ابوثور نے بھی ابتدا میں علم فقہ کی تحصیل احناف کے طرز پر کی ان کا
مسلک بھی حنفی تھا[2]، اور جس وقت بغداد میں امام شافعیؒ تشریف لائے، اس وقت امام ابوثورؒ
بغداد میں امام محمدؒ کے حلقۂ فکر اور مجلس درس کے مستقل حاضرباشوں میں تھے، امام شافعی کی
آمد کی خبر عام ہوئی تو امام ابوثورؒ ایک دن امام کرابیسی کے ساتھ، امام شافعیؒ کی خدمت
میں حاضر ہوئے، ابتدا میں وہ امام شافعیؒ سے محض ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئے، بلکہ امام
کرابیسیؒ نے تو ان سے یہ کہا کہ امام شافعیؒ آئے ہوئے ہیں، حدیث کے ساتھ ان کو فقہ میں بھی دسترس
حاصل ہے، ان کے پاس چلیں، کچھ تفریح ہی رہے گی، فقم بنا نسخر بہ[3] خود امام ابوثورؒ فرماتے ہیں کہ
میں روداری بن امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا[4] لیکن پہلی ہی ملاقات میں یہ احساس
ہوا کہ امام شافعیؒ کی ساری گفتگو میں صرف قال اللہ اور قال الرسولؐ کی تکرار جمیل ہے
یہ نشست رات گئے دیر تک جاری رہی، اور اس درجہ موثر ثابت ہوئی کہ ان دونوں
حضرات کے تبدیلی مسلک کا سبب بن گئی[5]، ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ امام شافعیؒ سے جس
مسئلہ پر ان کی اولین گفتگو ہوئی وہ ہر دور کا معروف اختلافی مسئلہ یعنی مسئلۂ رفع یدین تھا
اس مسئلہ پر امام شافعی کے دلائل ان کو دلنشین معلوم ہوئے، رفتہ رفتہ امام شافعیؒ سے
تعلق میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ امام محمدؒ نے ان کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور کہا کہ

---

[1] بغدادی۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۶ [2] ابن عبد البر۔ انتقاء ص ۱۰۷ [3] بغدادی۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۶ [4] شیرازی۔ طبقات ص ۸۳ [5] خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۶

میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ حجازی (امام شافعیؒ) میرے مقابلہ میں تم پر غالب آرہے ہیں! امام ابوثورؒ
نے بغیر کسی اعتذار کے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے اور یہ اس لیے بھی کہ وہ حق پر ہیں، اور اس کے بعد
امام شافعیؒ سے مسئلہ رفع یدین کے بارہ میں جو گفتگو ہوئی تھی، اس کو دہرا دیا[1]۔ تذکرہ نگاروں
نے اس کے بعد امام محمدؒ کے جواب یا ردعمل کا ذکر نہیں کیا، ورنہ بات اور واضح اور دلچسپ
ہو جاتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ امام شافعیؒ سے ان کی اس اثر پذیری میں، امام شافعیؒ کی پرکشش
شخصیت کے ساتھ خود ان کا فطری ذوق بھی معاون ثابت ہوا، ان کی طبیعت کا رجحان
علم حدیث کی جانب تھا، ان کے اساتذہ کی فہرست سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ ان میں
اکثریت نامور محدثین کی ہے، وہ خود اعلیٰ پایہ کے محدث تھے[2]، علم حدیث میں ان کی شان کا اندازہ
امام احمد بن حنبلؒ کے اس قول سے ہوتا ہے، کہ ھو عندی کسفیان الثوری، میرے نزدیک وہ
سفیان ثوری کی طرح (مرتبہ و منزلت میں) ہیں[3]، امام ابن حنبل نے ایک بار یہ بھی فرمایا کہ
ابوثور کو حدیث و سنت سے جو تعلق ہے، اس کو میں تقریباً چالیس سال سے جانتا ہوں[4]، علم حدیث
سے ان کے اس تعلق اور شغف کو دیکھنے کے بعد یہ بات کچھ زیادہ عجیب نہیں معلوم ہوتی کہ وہ
امام محمدؒ کے درس فقہ میں عرصۂ دراز تک شامل رہنے کے باوجود، اچانک امام شافعیؒ
سے پہلی ہی ملاقات کے بعد کیوں اس قدر متاثر ہو گئے اور فقہ حنفی کو بدعت تک کہہ گئے،
ان کا ایک قول ہے کہ

فترکنا ما کنا علیہ واتبعناہ[5] — ہم نے اپنی بدعت کو ترک کر دیا اور
ان (امام شافعیؒ) کے پیرو ہو گئے۔

اور بقول خطیب بغدادی رجع عن الرای الی الحدیث (مسلک اہل رائے،

---

[1] شیرازی۔ طبقات ص ۸۳ [2] ابن ہدایہ۔ طبقات ص ۹ [3] سبکی۔ طبقات کبریٰ ص ۲۲۷ [4] بغدادی۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۶

مسلک اہل حدیث کی طرف رجوع کیا، اس کے ساتھ ہی امام شافعیؒ کی ذات جو علم و فضل
اور حدیث و فقہ کی جامع تھی وہ بھی ایک بڑا سبب بنی، امام شافعیؒ کے حسنِ طریق اور
حسن جمع کو دیکھ کر وہ شدت سے متاثر ہوئے[1] اور ان سے ایسا تعلق قائم کیا کہ امام شافعیؒ
کے نامور ترین اصحاب میں ان کا شمار ہوا، امام شافعیؒ کے حالات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے
کہ انکے شاگردوں کے لیے انکی شخصیت نہایت پرکشش تھی، ان کے شاگرد ان پر پروانہ
وار نثار ہوتے نظر آتے ہیں، امام ابوثورؒ کے دوسرے اساتذہ بھی اساطینِ علم تھے، اسی دور میں
ایسی بھی ہستیاں موجود تھیں جو اسلام کی تاریخِ علم و فضل کا سرمایہ تھیں لیکن امام ابوثورؒ نے ان سب کی
موجودگی میں امام شافعیؒ کی ذات کو نہایت عمدہ طریقہ پر یہ کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا کہ
امام شافعیؒ کا نظیر و مثیل ہم نے تو کیا خود انھوں نے بھی کہیں نہیں دیکھا[2]، یہاں ہم دیکھتے ہیں
کہ امام شافعیؒ کے ان عراقی ...... شاگردوں یعنی امام زعفرانی، امام کرابیسی اور
امام ابوثور نے اپنے استاد کی جس قدر شاندار، طاقتور اور والہانہ انداز میں مدح و
توصیف کی ہے، وہ امام شافعی کے مصری و مکی شاگردوں کے تعریفی کلمات سے کہیں
زیادہ بڑھکر ہے، اور یہی وجہ ہے (شاید) کہ امام ربیع مرادی مصری نے ایک بار کہا کہ ہم لوگوں
(اصحاب مصر) نے امام شافعی کی صحیح قدر نہ جانی تھی، یہاں تک کہ ہمنے اہل عراق کو
دیکھا کہ وہ ان کا ایسا ذکر اور ایسا وصف بیان کرتے ہیں کہ ہم اتنی خوبی سے بیان نہیں کرسکتے[3]،

امام شافعیؒ کی یاد امام شافعیؒ کے ساتھ اگلی صحبتوں کی یادوں کو وہ لطف لے کر بیان کرتے،
فرماتے ہیں کہ جب امام شافعیؒ کو یقین آگیا کہ میں واقعی ان کا شاگرد ہوگیا ہوں تو ایک روز

---

[1] نووی۔ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۱ [2] ایضاً ص ۶۲ [3] نووی۔ تہذیب الاسماء ص ۶۲ [4] ایضاً۔

فرمایا کہ اے ابوثور اب اس سوال کا جواب سن لو، جس کے بارہ میں میں خاموش ہوگیا تھا،
کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم سے لغزش ہوجاتی ہے، لانک کنت متعنتا[4]، ایک بار ایک
مجلس میں بہت سے لوگ موجود تھے، اس میں امام ابوثور نے ایک مسئلہ کے بارہ میں
استفسار کیا، تو امام شافعی نے فرمایا۔ یا ابا ثور، الایناس قبل الاستناس، ابوثور اس
جملہ کا مطلب نہیں سمجھ سکے، امام شافعی نے فرمایا کہ ایناس، اونٹنی کے تھن کو ہاتھوں سے
صاف کرنے کو کہتے ہیں اور استناس، اس کے بعد اس سے دودھ دوہنے کو کہتے ہیں[5]، یعنی استناس
سے پہلے ایناس ضروری ہے۔

فقہی شان حدیث کے فطری ذوق اور اس کی جانب میلان طبیعت کے باوجود وہ ایک باکمال
فقیہ تھے، ان کی فقہی شان کم درجہ کی نہ تھی، درحقیقت وہ حدیث اور فقہ دونوں کے جامع
تھے، ابتدا میں امام محمدؒ سے کتب فقہ اور فقہائے حنفیہ کے طرزِ استدلال سے واقفیت اور اس
کتب فکر سے ایک طویل تعلق کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان پر فقہ کا رنگ ......
... زیادہ گہرا تھا، چنانچہ امام احمد بن حنبل سے ایک مرتبہ جب کسی مسئلہ کے متعلق استفسار
کیا گیا تو انھوں نے سائل سے کہا کہ یہ مسئلہ میرے علاوہ کسی اور سے پوچھو، فقہاء سے پوچھو، ابوثور
سے پوچھو[6]، امام النسائی فرماتے ہیں کہ امام ابوثور غلطیوں سے محفوظ اور ثقہ فقیہ ہیں[7]، ابو
عبداللہ حاکم کا قول ہے کہ امام ابوثور اپنے زمانہ میں اہل بغداد کے واحد مفتی و فقیہ تھے،
ساتھ ہی ائمہ حدیث میں سے ایک تھے[8]، امام ابوزکریا محی الدین نووی نے امام ابوثور کو حدیث
و فقہ کے علوم کا جامع قرار دیا ہے، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ امام ابوثور کی امامت، جلالت،

---

[1] شیرازی۔ طبقات ص ۸۳۔ [2] ابن عبدالبر۔ انتقاء ص ۹۳۔ [3] سبکی۔ طبقات کبری ج ۱ ص ۲۸۳ [4] ایضاً [5] ایضاً۔

ثقاہت اور براعت پر سب بیک زبان متفق ہیں۔[1] سلیمان شاذکونی کہا کرتے تھے کہ امام شافعی کی رائے کو لکھ لو، (قبول کر لو) اور ابوثور کے پاس جاؤ، مسائل میں ان سے بھی رجوع کرو، اس لیے کہ ان کا مسلک وہی ہے، جسے ہم سب جانتے ہیں (یعنی فقہ شافعی پر عمل اور اس کا تتبع)۔[2]

امام تقی الدین سبکی نے ایک ایسی مجلس میں ان کی ذہانت، قوت حفظ اور قوتِ استدلال کے واقعہ کو بیان کیا ہے جس میں یحییٰ بن معین، ابوخیثمہ اور خلف بن سالم جیسے نامور محدثین موجود تھے، اور ایک خاتون کے استفسار کے جواب میں خاموش اور متردد تھے، امام ابوثور نے آتے ہی خوبی کے ساتھ مسئلہ کو حل کر دیا، اور ساری مجلس کی داد و تحسین حاصل کی۔[3]

امام ابوثور کی فقہی و اجتہادی شان میں ان کے ماضی کا عکس ظاہر ہے، قیاس اور مسائل کے استنباط میں حنفی طرز فکر کا پرتو بہرحال ان پر اثر انداز ہوتا رہا، شاید اسی لیے ابوحاتم نے سخت الفاظ میں کہا ہے کہ وہ ایسے شخص ہیں، جو قیاس سے کام لیتے ہیں، چنانچہ خطا و صواب دونوں ان سے سرزد ہوتے ہیں اور وہ متعنت (تنگی میں ڈالنے والے) ہیں، ان کا وہ مقام نہیں جو مسمعین حدیث کا ہے، (ولیس محلہ محل المسمعین فی الحدیث)[4] امام سبکی نے حسب عادت ابوحاتم کے اس قول کو نقل کرنے کے مابعد اس پر گرفت کی اور صریح الفاظ میں

---

[1] نووی، تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱ [2] خطیب بغدادی: تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۹

[3] سبکی: طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۳ [4] امام سبکی کے خیال میں اصل عبارت میں مسمعین کے بجائے متسعین فی الحدیث یعنی مکثرین فی الحدیث ہے، کیونکہ ابوثور کا شمار مکثرین فی الحدیث میں نہیں تھا جب کہ انہی کے زمانہ میں دوسرے حفاظ حدیث کی کثرت تھی، امام ذہبی نے المتسعین فی الحدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں، انھوں نے بھی ابوحاتم کے اس قول کو غلو پر محمول کیا ہے۔ میزان الاعتدال ج ۱ ص ...

اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ابن ابی حاتم (ابوحاتم) کا غلو ہے، مطلقاً قیاس پر یقین رکھنا یا عمل کرنا باعث رد و قدح نہیں ہے، اور اس لیے ابوحاتم کا یہ قول ناقابل التفات ہے، امام ابوثور قطعاً اس کے محتاج نہیں کہ ان کی توثیق ابوحاتم کے ذریعہ ہو،[1] جبکہ امام احمد بن حنبل نے ان کی جلالت شان اور علوئے مرتبت کی توثیق کی ہو،[2] امام سبکی کی یہ صراحت بجا اور برحق ہے، امام ابن حنبل نے کئی بار فرمایا کہ ابوثور کے بارہ میں تو مجھے صرف خیر کا علم ہے؛ تاہم امام ابن حنبل یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے ابوثور کی چند باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں،[3] امام ابن عبدالبر کا قول ہے کہ ابوثور کی فکر و نظر صحیح اور خوب تھی مگر چند شاذ مسائل کے جن میں وہ جمہور سے مختلف تھے،[4]

کیا امام ابوثور مجتہد تھے

یہ صحیح ہے کہ امام ابوثور نے صراحت کے ساتھ مسلک حنفی کو ترک کرنے اور امام شافعی کے مسلک کو قبول کرنے کی بات کہی ہے، اور ان کا شمار ائمہ فقہاء شافعیہ میں کیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کامل طور پر امام شافعی کی تقلید نہیں کرتے، کئی ایسے مسائل ہیں، جہاں ان کو کوئی زیادہ قوی دلیل ملتی ہے تو وہ امام شافعی کی رائے کی مخالفت بھی کرتے نظر آتے ہیں، امام سبکی نے ان کے ذکر میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، صرف ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ مسلک شافعی کے قائل اور آخر تک اس پر عامل رہے،[5] مگر ایک دوسرے اہم تذکرہ نگار امام یافعی مالکی نے قطعیت کے ساتھ کہا کہ ولم یقلد احداً (انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی)،

---

[1] سبکی۔ طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۸ [2] ایضاً [3] امام ابن حنبل کو جو باتیں پسند نہیں آئیں انہیں سے ایک کی وجہ فتنہ خلق قرآن بھی ہے، جس کے متعلق امام ابوثور کا نقطہ نظر امام ابن حنبل سے قدرے مختلف تھا، یہی وجہ تھی جو ابوثور علیہ الرحمہ آزمائشوں کے زمانہ شباب و شدت میں ابتلا سے گویا کنارہ کش ہی رہے [4] یہ چند شاذ مسائل بھی علم حدیث سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ فقہ سے، حدیث میں ان شذوذ کے باوجود ان پر کسی نے مجروح ہونے کا الزام نہیں لگایا [5] یافعی۔ مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۲۹۔

یہ بھی کہا گیا کہ وہ صاحب مذہب مستقل، ان کا خود ایک الگ مسلک تھا، امام نووی نے بھی لکھ دیا کہ ابو ثور صاحب مسلک مستقل تھے[1]، ابن ندیم کا بھی یہی خیال ہے کہ ان کا اپنا ایک جدا مسلک تھا گو اس مسلک کا بنیادی تعلق مسلک شافعی سے ہی تھا، اکثر آذربائیجانی اور آرمینیا ان کے مسلک کے کاربند تھے[2] مگر بعد میں یہ مسلک اور اس کی پیروی ختم ہو گئی[3]، انصاف کی بات یہ ہے کہ مسلک شافعی ہی کے تبیع تھے، مگر ایک غیر معمولی علمی شان کے فطری تقاضے کے زیر اثر ان میں اجتہادی شان بھی تھی، اس لئے جن مسائل میں وہ اپنے دلائل کو زیادہ قوی سمجھتے تھے، ان میں وہ امام شافعی سے اختلاف کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے، ان کے ان ہی تفردات کی وجہ سے یہ شبہ عام ہوا کہ وہ خود ایک صاحب مسلک فقیہ تھے لیکن ظاہر ہے یہ شبہ صحیح نہیں، کیونکہ اصحاب شافعی اور کبار فقہاء شافعیہ میں امام مزنی، امام بویطی، امام زعفرانی اور بعد میں ابو القاسم انماطی، ابن سریج اور امام الحرمین وغیرہ بھی اپنے تفردات اور اختلافی رایوں کی وجہ سے ممتاز ہوئے، مگر اس بنیاد پر ان کو مسلک شافعی سے منحرف قرار نہیں دیا گیا، یہ بات اور ہے، کہ انماطی اور ابن سریج وغیرہ کے تفردات کو فقہ شافعی میں اعتماد اور اعتبار کا درجہ حاصل ہے، جب کہ امام ابو ثور کے تفردات کو وہ اعتبار حاصل نہیں ہو سکا[4]، ابن منذر، ابن جریر اور ساجی کا یہی خیال ہے، اعتبار اور اعتماد حاصل نہ ہو سکنے کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، امام ابو ثور کے تفردات دلائل کے اعتبار سے کمزور نہیں ہیں بلکہ امام نووی کے الفاظ میں تو اکثر تفردات ایسے ہیں جن میں ان کا مسلک، مسلک شافعی سے زیادہ قوی نظر آتا ہے[5]، بعض متشدد شافعیوں نے امام ابو ثور کے مقابلہ میں دوسرے ایسے اصحاب کو زیادہ اہمیت دی جو علم و فضل میں امام ابو ثور

---

[1] نووی۔ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱ [2] ابن ندیم۔ فہرست ص ۲۰۹ [3] خضری۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۰۵ [4] نووی۔ تہذیب ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱ [5] ایضاً

سے کہیں کمتر تھے، امام نووی نے اس رجحان پر سخت گرفت کی، اور کہا کہ امام ابو ثور حدیث و فقہ کے جامع اور چند ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، ان کے احوال جمیل اور ان کے مناقب و فضائل اور محاسن بے شمار ہیں، وہ اس سے بے نیاز ہیں کہ اب ان کو شہرت کے سہارے دیئے جائیں[1]، اس بحث میں سب سے عمدہ رائے یہ ہے کہ وہ صاحب اختیار فقیہ تھے۔ وله اختیارات[2]۔

وفات | سنہ وفات کے بارہ میں دو مختلف رائیں ہیں، ابن خلکان نے ان کا سنہ وفات ۲۴۶ھ ذکر کیا ہے، جب کہ دوسرے تمام تذکرہ نگاروں نے ۲۴۰ھ کا ذکر کیا ہے، عبید بن محمد البزاز جو امام ابو ثور کے خاص شاگرد اور صاحب ابی ثور کہلاتے ہیں، ان کا قول ہے کہ ابو ثور کا انتقال صفر ۲۴۰ھ میں ہوا، ستر برس عمر پائی، بغداد کے مقبرہ باب الکناس میں تدفین ہوئی۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں ابو ثور کے جنازہ سے واپس آیا تو مجھ سے والد صاحب نے دریافت کیا کہ کہاں سے آرہے ہو، میں نے کہا، ابو ثور کے جنازہ سے یہ سن کر امام احمد بن حنبل نے کہا اللہ ان پر رحم کرے وہ واقعی فقیہ تھے[3] (امام احمد ابن حنبل، ممکن ہے اپنے ضعف اور کبرسنی کی وجہ سے نماز جنازہ میں شریک نہ ہوئے ہوں، کیونکہ چند مہینوں کے بعد وہ بھی اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔)

امام ابن حنبل کے ممدوح | امام احمد بن حنبل، ان کا نہایت احترام کرتے تھے، ان کی تعظیم کرتے تھے، اور ان کا یہ جملہ تو بہت مشہور رہا، کہ میں ابو ثور کو چالیس پچاس برس سے جانتا ہوں اور ان کے بارہ میں صرف خیر کا علم رکھتا ہوں، وہ میرے نزدیک سفیان ثوری جیسے ہیں، امام احمد بن حنبل کی یہ مدح شاید اس لیے بھی تھی کہ مسئلہ خلق قرآن میں امام ابو ثور ان کے مکمل ہم نوا نہیں تھے، پھر بھی وہ اس فتنہ خارزار میں اپنے دامن کو کمال احتیاط سے کانٹوں سے بچائے رکھنے میں کامیاب ہوئے جب کہ

---

[1] نووی۔ تہذیب ج ۲ ص ۲۰۰، ۲۰۱ [2] عسقلانی۔ توالی التاسیس ص ۳۹ [3] بغدادی۔ تاریخ ج ۶ ص ۶۹

ان کے دوسرے ساتھی امام کرابیسی ان کانٹوں میں الجھ گیے، اسی بناء پر ان کے بارہ میں امام احمد بن حنبل نے کلام کیا تو وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہوئے، جب کہ امام ابوثور کا مقام پہلے سے بلند ہو گیا۔[1]

تلامذہ | امام ابوثور کے اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ کی فہرست بھی ایک سلسلۂ زریں ہے، ان سے کسب فیض کرنے والوں میں امام مسلم، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، ابو حاتم رازی، ابو القاسم بغوی، قاسم بن زکریا مطرز، محمد بن اسحاق السراج، ادریس بن عبد الکریم، ابن جنید اور عبید بن محمد البزاز صاحب ابی ثور جیسے نامور ائمۂ فن ہیں اور یہ سب اپنے استاذ کی جلالت و ثقاہت پر متفق ہیں۔

سرمایۂ معنوی | نہایت افسوس کی بات ہے کہ آج امام ابوثور کی کسی تالیف یا کسی رسالہ تک ہماری رسائی نہیں، صرف مراجع میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ان کی علم الاحکام میں کئی مصنفات ہیں جن میں حدیث اور فقہ کی جامعیت عمدہ طریقہ پر موجود ہے۔[2] انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، احادیث پر محنت کی،[3] ان کی کئی کتابیں ہیں،[4] جن میں انھوں نے اختلافی مسائل کا ذکر کر کے اپنے مختار قول کے حق میں دلائل پیش کیے ہیں، ان کی ایک کتاب امام مالک و شافعی کے اختلافات کے باب میں ہے، اس میں وہ اپنے مسلک کی بھی جابجا وضاحت کرتے جاتے ہیں، اس کتاب میں اور دیگر کتابوں میں اکثر جگہوں پر ان کا میلان امام شافعی کی جانب ہے۔[5] ابن الندیم نے لکھا کہ امام شافعی کی کتاب المبسوط کی ترتیب پر ان کی بھی ایک مبسوط ہے، مگر افسوس کہ اب ان میں سے ایک بھی محفوظ و موجود نہیں ہے۔[6]

---

[1] خضری: تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۵۰ [2] ابن خلکان: وفیات ج ۱ ص ۵ صاحب کشف الظنون کو بھی ان میں سے کسی رسالہ کی خبر نہیں [3] بغدادی۔ تاریخ ج ۶ ص ۶۵ [4] ابن ہدایہ۔ طبقات ص ۲ [5] ابن عبد البر۔ انتقاء ص ۱۰۷ [6] ابن ندیم۔ الفہرست ص ۲۸۶۔

بعض مسائل و فوائد | امام ابوثور کے متعلق عبدری نے لکھا ہے کہ وہ دین (قرض) پر وصیت کو مقدم سمجھتے تھے، جب کہ اجماع اس پر ہے کہ قرض مقدم ہے، گویا ان کی یہ رائے اجماع کے خلاف تھی، اور یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے، اسی لیے شارحین نے اس کی تاویلیں پیش کیں کہ یا تو ابوثور کو اجماع کا علم نہیں تھا یا پھر وہ اس اجماع کو خلاف اصل سمجھتے تھے یا پھر عبدری سے مروی یہ روایت ہی صحیح نہ ہو، کیونکہ ابن منذر نے ابوثور سے ایک مسئلہ نقل کیا ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنے غلام کے بارہ میں یہ وصیت کی کہ اگر یہ غلام اس کے بیٹے سے جدا نہ ہو تو اسے آزاد کر دیا جائے اور وصیت کنندہ پر اتنا قرض ہے جو اس کے کل مال سے زیادہ ہے، تو اس صورت میں یہ وصیت باطل ہو جائے گی اور اس غلام کو ادائی قرض کے لیے فروخت کر دیا جائے گا، اور اگر ورثاء اسے آزاد بھی کر دیں تو یہ آزادی جائز نہ ہوگی، ظاہر ہے یہ قول عبدری کے منقول قول کے خلاف اور قول جمہور کے موافق ہے، اس لیے عبدری کے قول کا صحیح نہ ہونا ہی زیادہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے، ایک مسئلہ نووی نے نقل کیا ہے کہ ابوثور نے فرمایا کہ پانچ درہم سے کم کی چوری میں قطع ید کی سزا جاری نہ ہوگی، ان کا یہ قول ان کے اس دوسرے قول کے مشابہ ہے کہ مہر کی مقدار کم سے کم پانچ درہم ہے، ایک اور مسئلہ میں بیع و شراء کے باب میں وہ کہتے ہیں کہ عیب کی بناء پر رد کا اختیار صرف رضا سے نہ ہوگا، بلکہ اس کے لیے رضا بالکلام ضروری ہے، اور گویا زبان سے فعلاً اس کا اظہار شرط ہے، جمہور شوافع کا مسلک یہ ہے کہ رد بالعیب کا اختیار صرف علی الفور ہوگا، ابوثور سے یہ مسئلہ بھی منقول ہے، کہ اگر دو آدمیوں نے سمت قبلہ میں اپنے اپنے ظن غالب سے کام لیا اور ایک نے دوسرے کی مخالف سمت رخ کیا تو اس صورت میں اپنی اپنی سمت پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی اقتدا کر سکتا ہے، جیسا کہ کعبہ کے گرد نماز پڑھتے ہوئے ہوتا ہے، کہ ایک کی سمت دوسرے

معارض ہوتی ہے، پھر بھی وہ اس کی اقتدا کر سکتا ہے، ایک اور مسئلہ میں امام ابوثور نے تیل اور گھی کو پانی کے حکم پر محمول کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح دو قلے (قلہ ایک پیمانہ) پانی میں نجاست خفیفہ غیر مغیرہ (یعنی اس قدر کی نجاست جس سے رنگ، مزہ اور بو نہ بدلے) کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا، اسی طرح تیل یا گھی اگر دو قلے ہوں اور ان میں نجاست خفیفہ غیر مغیرہ گر جائے تو وہ بھی ناپاک نہ ہوگا، حالانکہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ پانی کی حیثیت دوسری سیال چیزوں سے جدا ہے، دوسری سیال چیزیں دو قلے کیا کئی قلے ہوں تو بھی نجاست . . . کے گر جانے سے وہ ناپاک ہو جائے گی، کیونکہ عام طور پر دوسری سیال چیزوں کا محفوظ رکھنا ممکن ہے، جب کہ عادۃً پانی کے بارہ میں ایسا نہیں ہے[1]، امام ابوثور کے یہ تفردات بہرحال ان کی ذہانت و قوت استدلال کا مظہر ہیں۔

---

[1] سبکی، طبقات کبریٰ، ج ۱ ص ۲۸۲۔

تبع تابعین

جلد دوم

اس میں مع، صاحب دعوت و عزیمت تبع تابعین عظام مثلاً ابو معشر نجیح سندھی، اسد بن فرات، ربیع بن صبیح بصری، شریک بن عبداللہ نخعی، عبدالرزاق ابن ہمام، عبدالعزیز بن عبداللہ ماجشون، مبارک بن فضالہ، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی، محمد بن ادریس (امام شافعی)، موسیٰ بن جعفر الملقب بہ کاظم رحمہم اللہ وغیرہ کے سوانح و حالات اور ان کی علمی و دینی و مذہبی خدمات اور کارناموں کی تفصیل مستند مآخذ کے ذریعہ سے بیان کی گئی ہے، شروع میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے پانچ صفحوں میں پیش لفظ ہے، مرتبہ ڈاکٹر حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی سابق رفیق دارالمصنفین۔

قیمت ۔ ۲۲ روپے

معارف کی ڈاک

پاریس ۱۴ رجب ۱۴۰۳ھ
سہ شنبہ

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: چند دن ہوئے پا بہ رکاب حالت میں ایک خط کی رسید گزرانی تھی، آج سفر سے واپس آیا، تو سیرۃ النبی کی ساتویں جلد شرف بخش ہوئی، دلی شکریہ عرض ہے، اگرچہ میں دارالمصنفین کا دوامی رکن ہوں، لیکن مسرت ہوتی اگر اس تحفہ عظیم کا بل بھی بھیج دیا جاتا، تاکہ ادائی کی مسرت بھی حاصل کرتا، اور پڑھنے کی تشویق بھی پاتا، تجربہ ساہو کہ تحفے کو آدمی اس قدر غور سے نہیں پڑھتا جتنا خریدی ہوئی چیز کو،

کتاب کی پہلی اور سرسری ورق گردانی تو کر چکا ہوں، ایک طالبعلمانہ سوال پیش ہے شاید آپ کا تاثر و رد عمل میری تشفی یا تصحیح کر سکے گا،

صفحہ (۱۴۹) مابعد میں خلافت بنی آدم کی دلچسپ بحث ہے، کچھ عرصہ ہوا روز مرہ کی تلاوت کلام پاک میں ان آیتوں پر میں ٹھٹکا تھا،

"فَتَلَقّٰىٓ اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ قُلْنَا اهْبِطُوْا ......" (بقرہ ۵) اور "وَعَصٰىٓ اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى قَالَ اهْبِطَا ....." (طٰہٰ)

کیا توبہ قبول کرنے کے بعد سزا دی جا سکتی ہے، ؟ زمین پر جانے کا حکم، جو دونوں آیتوں میں قبول توبہ کے بعد دیا گیا ہے، کیا "سزا" کے لئے ہو سکتا ہے ؟ میری ناقص سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ سزا کے لئے نہیں بلکہ اعزاز و اکرام یا فضل و انعام کے لئے ہے، اور حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی نئی خدمت (خلافۃ اللہ فی الارض) کا جائزہ لینے کے لئے زمین پر جاؤ، واللہ اعلم،

نیاز مند و بیدینہ

م ح ا

معارف: حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی جلد ہفتم کے صفحہ ۱۴۹ و مابعد میں خلافت بنی آدم کی جو دلچسپ بحث ہے، اس میں اسکا ذکر نہیں کہ قبول توبہ کے بعد حضرت آدمؑ کو سزا دی گئی، اور وہ جنت سے نکال دیئے گئے، اس سلسلہ میں بعض مفسرین کی رائیں پیش کی جاتی ہیں، امام ابو عبد اللہ قرطبی متوفی ۶۷۱ھ تحریر فرماتے ہیں:-

"جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج اور دنیا میں ہبوط محض سزا دینے کے لئے نہ تھا، کیونکہ قبول توبہ کے بعد زمین پر بھیجے گئے تھے، اس کی غرض یا تو ان کی تربیت رہی ہو، یا آزمایش اور امتحان،

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے خلد سے نکلنے اور دنیا میں سکونت اختیار کرنے سے اس حکمت ازلی کا ظہور ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کی نسل کی افزایش کرکے اسے ذمہ داریوں کا مکلف بنائے گا اور اس کی جانچ کرے گا جس کے بعد ہی اس پر ثواب کا فیصلہ مترتب ہو سکے گا، جنت و دوزخ تکلیف کی جگہیں نہ تھیں، پس درخت کا پھل کھانا، انکے ہبوط کا سبب ہو گیا (الجامع لاحکام القرآن جلد ا ص ۳۲۷)،

مولانا اشرف علی تھانوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

ایک سزا تو ظاہری ہوئی کہ یہاں سے زمین پر جاؤ، اور دوسری سزائے باطنی ہے کہ بعضوں میں باہم عداوتیں بھی قائم رہیں گی جن سے لطف زندگی بہت کچھ کم ہو جائیگا"

(تفسیر بیان القرآن سورہ بقرہ)

مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:-

"یہ حکم بطور سزا و عتاب نہیں مل رہا ہے، اس لئے کہ خطا تو اب معاف ہی ہو چکی ہے بلکہ یہ محض نتیجہ طبعی کا ظہور ہے شجر ممنوعہ کے پھل کھا لینے سے طبعی اثرات مترتب ہو رہے تھے، اس کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی، روح کے داغ دھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم و مادے سے بھی غلط کاری کے نقش مٹ جائیں کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے اگر زہر کھالے اور فوراً سے اپنی عصیاں کاری پر متنبہ ہو جائے، اور وہ رو رو کر گڑگڑائے صدق دل سے توبہ کرے، اس سے گناہ تو عجب نہیں، کہ معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظام جسم پر مترتب ہوتے آ رہے وہ تو بہرحال ہو کر رہیں گے، خشوع و خضوع، انابت قلب، ان مادی اثرات کو مٹانے کے لئے کافی نہیں،" (تفسیر ماجدی سورۂ بقرہ)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:-

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے توبہ اور اصلاح کی راہ کھولی ہے، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش صادر ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی، اس کے بعد اُن کو اس دنیا میں جو بھیجا اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے، بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں، اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر

حاصل کریں جس سے وہ نکالے گئے۔" (تدبر قرآن جلد اول ص ۱۲۹)

آپ کی رائے سے اتفاق، اس تفصیل کے بعد کیا جاسکتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور ابلیس کا ذکر بطور تقابل ہوا ہے، ابلیس نے خدا کے حکم کی سرتابی کی تو اسے اپنی غلطی اور نافرمانی پر تنبہ نہیں ہوا، بلکہ اس پر وہ مصر رہا، اس کے برخلاف حضرت آدمؑ نے شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا، اور ان سے غلطی سرزد ہوگئی، تو انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور فوراً بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑا کر معافی مانگ لی، باقی رہا زمین پر آدمؑ کا ہبوط تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ زمین میں خلیفہ بنا کر بھیجے جائیں گے، توبہ کے بعد پھر وہ اپنے مقام خلافت پر سرفراز کیے گئے، زمین پر ان کا ہبوط بطور سزا کے نہیں، بلکہ بطور امتحان کے ہوا، تاکہ ہدایتِ الٰہی کے مطابق دنیا میں زندگی گزارنے کے بعد اولادِ آدم جنت کی مستحق ٹھہرے، سزا کا تصور دوسرے مذاہب کے ذریعہ آیا، عیسائیوں کا عام خیال آدم کے ازلی و ابدی گنہگار ہونے کا ہے، جس کے حل کے لئے انھوں نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا ہے،

لیکن اوپر بزرگوں کے مندرجہ اقتباسات بھی قابل غور ہیں،

(۲)

مسقط

۱۰ر فروری ۸۳ء

محترم و مکرم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:۔

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے، حالاتِ حاضرہ کے مطابق دارالمصنفین کی خدمات قابلِ صد تحسین و مبارک باد ہیں، حقیقت یہ ہے، کہ اس مادی دور میں دارالمصنفین کی علمی خدمات اہلِ نظر

کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے، ماہنامہ "معارف" میں حالاتِ حاضرہ کے دل و دماغ کو مطمئن کر دینے والا تحقیقی اور علمی کام میری معلومات کے مطابق بہت ہی کم کہیں ہوتا ہوگا، مجھے معارف کا مطالعہ کرتے ہوئے تقریباً دو یا تین سال ہوگئے ہیں، اور اب حالت یہ ہے کہ معارف کا انتظار بڑی بے چینی سے رہتا ہے،

میں نے جس بات کو محسوس کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس معیار کی سیرۃ النبی دارالمصنفین نے تصنیف کی ہے، اسی معیار کی قرآن کریم کی تفسیر پر کام کرنا چاہئے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آپ کے ادارے کی بہت ہی بڑی خدمت ہوگی، میرے خیال کے مطابق ہر نئے دور میں نئی اور تحقیقی تفاسیر کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ قرآن کریم کے تدبر کا مقصد پورا ہوتا رہے،

علاوہ ازیں اخبارِ علمیہ کا ایک مضمون پرانے معارف میں ہوتا تھا جو کہ اب اس میں نہیں ہوتا، محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اگر قرآن کریم کی تفسیر پر کام کریں تو یہ ایک انشاء اللہ بہت ہی تحقیقی و علمی کام ہوگا، دراصل قرآن کریم کی تفسیر پر کام کرنے والا ایک ایسا قابل اور ذہین انسان ہونا چاہئے جو دورِ جدید کے علوم سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو، بلکہ ایک تحقیقی و علمی نگاہ رکھتا ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے دین کا فہم و بصیرت بھی عطا کی ہو، مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ گذارشات مولانا محترم تک پہنچائیں گے، اور پھر ظاہر ہے کہ آپ کا تعاون بھی انھیں حاصل ہوگا،

چونکہ یہ ایک بہت لمبا کام ہے اس لئے جوں جوں کام ہوتا جائے اسے مختلف جلدوں کی شکل میں شائع کیا جائے، تاکہ اہلِ ذوق کی تشنگی بھی بتدریج ختم ہوتی رہے، ایک عرصہ ہوا میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن میں پڑھا تھا کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر تین حصوں میں تقسیم کی جائے، بلکہ وہ ایسا کرنے کا ارادہ بھی فرما چکے تھے، لیکن افسوس کہ

وہ سیاسی زندگی میں پڑ کر اس کام کو نہ کر سکے، اور اگر کیا بھی تو ضائع ہو گیا، اس کی تقسیم مندرجہ ذیل تھی:

(۱) مقدمۂ تفسیر (۲) تفسیر البیان (۳) ترجمان القرآن،

(۱) مقدمۂ تفسیر قرآن کے مقاصد و مطالب پر اصولی مباحث کے مجموعہ کا نام ہے، اور اس میں مطالب قرآنی کے جوامع و کلیات مدون ہو جائیں،

(۲) تفسیر بیان القرآن نظر مطالعہ کے لئے ہے،

(۳) ترجمان القرآن عالمگیر تعلیم و اشاعت کے لئے ہے،

وہ اس کام کو انجام دے جاتے تو یہ ایک بہت بڑا علمی کام ہوتا، لیکن قدرت کو منظور نہ تھا، چونکہ قرآن کریم تمام علوم کا منبع ہے، اس نظر سے اس کی تفسیر و مطالعہ سے ہر ذہین آدمی کو مطمئن کیا جا سکتا ہے، جس طرح اس کام کے لئے محنت کی ضرورت ہے، اسی طرح سے اُس کا اجر و ثواب بھی بہت زیادہ ہے، میری نگاہ اور علم میں صرف محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک ایسی شخصیت ہے جو توفیق الٰہی سے اس کام کو انجام دے سکتی ہے،

اس بڑے کام میں ظاہر ہے کہ مالی تعاون کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اگرچہ میں کوئی بہت بڑی رقم تو پیش نہ کر سکوں گا بہر حال حسب توفیق ضرور پیش کروں گا، بارگاہِ خداوندی میں خلوص نیت سے ایک کھجور بھی دی جائے تو وہ بھی بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب بن سکتی ہے

امید ہے کہ آپ میری گذارشات پر غور فرمائیں گے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی سعادتوں سے نوازے، اپنے صابر و شاکر بندوں میں شامل فرمائے! آمین ثم آمین

خدا حافظ،

خیر اندیش:- بندہ فقیر گلزار احمد

منسٹری آف ڈیفنس

سلطنت آف عمان

باسمہٖ تعالیٰ

جرارگبہ، سرلاہی، نیپال

۱۲ رمارچ ۱۹۸۳ء

محترم جناب سید صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ

فروری کے معارف میں "ولی عہد نیپال کا خط مولانا عبدالحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام" از جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ص ۱۴۳ تا ۱۵۵ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا،

آج سے ۷۳ سال قبل یا ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک نیپال کا کوئی بھی ولی عہد آلہ آباد میں جلاوطن نہیں رہا (ملاحظہ ہو جنگ بہادر رانا، یا رانا شاہی کی مختصر سی تاریخ)

جنگ بہادر ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے، وہ پڑھے لکھے نہ تھے، گورکھا چھ نمبر پہاڑی علاقے میں ان کا آبائی مکان تھا، وہ اپنے علاقے میں بچپن میں گائے چرایا کرتے تھے، ان کا اصلی نام ویر نرسنگھ تھا، وہ کنور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے ماموں ماتھبر سنگھ تھاپا جو اس وقت وزیر اعظم تھے (انہی کا نام ویر نرسنگھ کنور سے جنگ بہادر کنور رکھا، وہ ملٹری کے سپاہی سے ترقی کر کے ۱۸۴۶ء میں شری پانچ سورندر ویر وکرم کے حکم سے رانا بن گئے، اور ۱۸۵۲ء میں انھوں نے راج دربار کی اندرونی سازش اور انگریزوں کی شہ سے شری تین کا اقتدار حاصل کیا، ۱۸۶۷ء میں انھوں نے اپنے خاندان میں نیپال کی حکومت محدود رکھنے کے لئے رول سسٹم مقرر کیا، بالآخر انتیس ۲۹ برس لگاتار حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۷ء ہی میں پتھر گھٹا عالی ضلع سرلاہی نیپال میں ان کی موت ہو گئی ان کی موت کسی سازش کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ شکار کرتے وقت اچانک جنگل میں سفید شیر نے ان پر حملہ کر دیا، اور یہ واقعہ پُراسرار سمجھا جاتا ہے؛ ان کے مرنے کے بعد ان کا چھوٹا بھائی دھیر شمشیر جو بڑا چالباز تھا، ان کے بڑے لڑکے جگت جنگ کو

ادھیوراج شری پانچ ترلوکیہ ویر وکرم کو جوان کے داماد بھی تھے، پتھر گھٹا وا اسنکار . . . .
. . . . کے لئے بھیج دیا، اور ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر راج
کا کام سنبھالنے کے بہانے سے شری پانچ سوریندر سے اختیارات حاصل کرکے اپنے بڑے
بھائی ڈاکٹر دیپ سنگھ کو شری تین کے عہدے پر فائز کروا دیا، پتھر گھٹا سے آنے کے بعد شری پانچ
ترلوکیہ نے چاہا کہ ہمارے شاہی اختیارات جو محدود کئے گئے تھے، بحال کر دیے جائیں، تو ان
کی موت ہوگئی، پھر ان کے بھائی شری پانچ ادھیراج کمار "نریندر ویر وکرم نے اقتدار
حاصل کرنے کی کوشش کی تو انگریزوں سے کہکر دھیر شمشیر نے ادھیراج کمار نریندر کو اور جنگ بہادر
کے بڑے لڑکے جگت جنگ کو الٰہ آباد جلا وطن کروا دیا، پھر ڈاکٹر دیپ سنگھ نے جگت جنگ کو
الٰہ آباد سے بلوا کر پردھان سیناپتی کا عہدہ عطا کیا، ۱۸۸۴ء میں دھیر شمشیر کی موت ہوگئی،
۱۸۸۵ء میں دھیر شمشیر کے لڑکوں نے سازش کرکے ڈاکٹر دیپ سنگھ کو قتل کر دیا، جگت جنگ بھی
مارا گیا، جنگ بہادر کا چھوٹا لڑکا "پدم جنگ" جان بچا کر ہندوستان بھاگ گیا، اس کے بعد ان
کے لڑکوں کو ہمیشہ کے لئے راناشاہی سے محروم کر دیا گیا، اور دھیر شمشیر کے سترہ لڑکوں
کو اقتدار مل گیا، خاندانی راناشاہی ۱۹۵۱ء میں موہن شمشیر جنگ بہادر کے عہد اقتدار میں
ایک سو چار برس کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شاہی خاندان کے فرد کی لکھی ہوئی غزل ہے تو
تو وہ اپنے کو جنگ بہادر رانا نہیں لکھے گا، اور اگر کسی جنگ بہادر رانا کی غزل لکھی ہوئی ہے
تو وہ اپنے کو یوراج نہیں لکھے گا، رانا نے کبھی اپنے کو ملک نیپال کے بادشاہ ہونے کا دعویٰ
نہیں کیا، وہ شری تین ہی رہ کر اقتدار پر قابض رہے، اپنے وقت میں بادشاہ کو بھگوان
بنا کر اپنی حکومت اور اقتدار کو بحال رکھا، رانا شکم مادر سے ہی جنرل پیدا ہوتے تھے، پھر وہ

کمانڈنگ جنرل ہوتے، پھر جنگی لاٹ، پھر کمانڈر چیف، اور پھر آخر میں شری تین کے بعد سے
ان کا عہدہ ختم ہو جاتا تھا، نیپال میں اب ۱۹۵۱ء کے بعد سے شری تین کا عہدہ ہمیشہ کے لئے
ختم ہوگیا، اب بادشاہ کے بعد پردھان منتری کا عہدہ قائم کیا گیا ہے، شری پانچ مہاراجہ
دھیراج اور راج تنتر کے ماتحت پنچایتی پرجاتنتر قائم ہے، اور موجودہ شاہ نیپال کا مبارک
نام شری پانچ مہاراجہ دھیراج ویریندر ویر وکرم شاہ دیو ہے، یہ ہے نیپال کے جنگ بہادر
رانا کی مختصر سی تاریخ جو حاضر خدمت ہے، اگر جگہ ہو تو میرے خط کو معارف کے
مبارک صفحوں پر شائع کر دیا جائے تاکہ جو خط ولیعہد جنگ بہادر رانا کے نام شائع کیا
گیا ہے، اس پر دوبارہ غور و خوض کیا جائے،   والسلام

صلاح الدین ربانی

ڈربن

۴ جون ۸۳ء

مکرمی المحترم، سلام مسنون مئی ۸۳ء کے معارف میں جناب ڈاکٹر حمید اللہ کا خط
پڑھا، رات بھر نیند نہیں آئی، صبح ۴ بجے بستر سے اٹھ گیا، نماز اور تلاوت کلام پاک کے
بعد ان کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا، یہ طویل ہوگیا ہے جو جلد پہونچے گا، خدا کرے اس میں
افادۂ عام ہو، میں آپ پر واضح کر دوں کہ اعظم گڈھ کی کانفرنس کے خلاف آوازیں اٹھیں گی،
تحریک چلے گی اور چلائی جائے گی، لیکن مرد مومن کے لئے کسی مداہنت، ضعف اور کمزوری کی
ضرورت نہیں، میں تو اس معاملہ میں اس قدر سخت ہوں کہ اگر میں کانفرنس میں
ہوتا تو ایک اعلامیہ میں ایک خاص شق کو داخل کراتا، اور وہ یہ ہوتی کہ اسلام کی تعبیر و تفسیر کا حق
صرف اہل اسلام کو ہے، یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب کے پیروؤں کو نہیں ہے، ڈرنے کی کیا ضرورت ہے،

دورِ استعمار میں صدیوں ہم مہر بہ لب رہے، وقت آگیا ہے کہ بولیں

ع: خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

میرے طویل خط کا انتظار کیجیے، اس وقت آپ کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اعظم گڈھ کانفرنس کی تحریک کو آگے بڑھائیں اور اس کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کریں، اگر خدانخواستہ یہ تحریک ناکام ہوئی تو آپ اور ہم سب امتِ مسلمہ کو رسوا کریں گے، اور آپ کے لئے عند اللہ ماخوذ ہوں گے، یہ کانفرنس اس صدی کا سنگ میل ہے، اور تاریخِ اسلام کا نیا موڑ بھی؛ والسلام

حبیب الحق ندوی

علی گڑھ، ۱۲ر جون ۱۹۸۳ء

مکرمی و محترمی جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب السلام علیکم

اسلام اور مستشرقین پر اب دوسرا سمینار کہاں اور کب ہو رہا ہے؟ پہلے سمینار کی تفصیلی روداد آپ نے بہت ہی دلچسپ انداز میں تحریر کی تھی، اور پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا تھا کہ سب کچھ نظروں کے سامنے ہو رہا ہے، اس طرزِ تحریر پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

اسلام اور مستشرقین سے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مغربی مستشرقین زیادہ تر غیر مسلم ہیں اور ان میں غالباً غالب اکثریت ایسے حضرات کی ہے جن کے محرکات دینی اور سیاسی ہی ہیں، انگریزی کی مرتب کردہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کو سب سے بڑے مرجع کا درجہ حاصل ہے اور ہمارا انگریزی داں طبقہ اس کو اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ خیال کرتا ہے، اسی کتاب کو ہماری موجودہ یونیورسٹیوں میں مصدر کی حیثیت بھی حاصل ہے اور اسے اسلامی ماخذ سمجھ کر اس سے ہی دلیلیں قائم کی جاتی ہیں، اور اسلامیات سے متعلق پی ایچ ڈی کا ہر طالب علم اپنی تحقیق کی ابتدا

اسی کتاب سے شروع کرتا ہے، اصلیت یہ ہے کہ مغربی مستشرقین نے اس انسائیکلو پیڈیا میں علمی خیانت سے کام لیا ہے اور اسلامی تاریخ کو اس طرح غلط رنگ میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا متنفر و بدگمان ہو جائے، آپ کے سمینار میں جناب مولانا سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ ان میں بہت سے لوگ علمی خیانت سے کام لے کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ڈنک مارتے رہتے ہیں، اور اس انداز سے کہ بظاہر ایک ایسا معمولی سا اشارہ کر جاتے ہیں کہ جو شخص بھی ان کو ..... پڑھے وہ اس کو ایک علمی حقیقت سمجھ کر جذب کرے، اور پھر آگے سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک غلط لائن پر پڑ جائے اور بظاہر معمولی طور پر ذہن کا کانٹا بدل دینے کے بعد وہ مطالعہ کرنے والے کو ایک ایسی لائن پر لگا کر آگے چلا جاتا ہے کہ وہ منزلِ مقصود سے بہت دور نکل جائے، یہ انسائیکلو پیڈیا کسی بھی لحاظ سے تعریف و تحسین کی مستحق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی زہر کی پڑیا ہے جو پڑھنے والے کو گمراہ ... کر دیتی ہے، اس لئے اس ناچیز کا یہ خیال ہے کہ اسلام اور مستشرقین نامی ادارہ کو سب سے پہلے اس کا نعم البدل تیار کرنا چاہئے تاکہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ خاص کر اسلامیات کے اساتذہ اور طلبہ اس کی زد سے بچے رہیں، یہ بڑا کام ضرور ہے اس میں وقت بھی بہت لگ سکتا ہے، اخراجات بھی زیادہ ہونے کی امید ہے سخت محنت اور کاوش کی بھی ضرورت ہے لیکن مغربی مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو روکنے کے لئے یہ کام بھی کرنا اشد ضروری ہے .... اس کام کے لئے مالی تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے اور عالم اسلام کے نامور عالم، ممتاز دانشور، عظیم مفکر، مشہور محقق اور معروف خطیب حضرت سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے رہبری کے لئے استدعا کی جا سکتی ہے، کیا میں امید کروں کہ آپ کی انجمن اسلام اور مستشرقین اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی، فقط

احقر اکمل ایوبی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

وفیات

آہ! سکندر علی وجد

از ۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی رفیق دارالمصنفین

۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کو اردو کے مشہور شاعر سکندر علی وجد کا انتقال ہو گیا، عمر ستر سال کی تھی، وہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء کو ویجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اورنگ آباد ہی میں ہوئی، اور وہیں ۱۹۳۰ء میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا، اور اسی سال کالج میگزین "نورس" کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تھے، ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے بی اے کی ڈگری لی، ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سول سروس کے امتحان مقابلہ میں کامیابی کے بعد عہدۂ منصفی پر ان کا تقرر ہوا، ۱۹۵۲ء میں ریاست حیدرآباد کے ضلع سنگاریڈی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی رہے، پھر ۱۹۵۶ء میں سشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے، اور اسی سال ملک کی تنظیم جدید میں مہاراشٹر منتقل ہوئے، ۱۹۶۴ء میں قبل از وقت پنشن لی، اور انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۷۰ء میں انھیں "پدم شری" کا اعزاز ملا، ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر سے انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا۔

وہ ۱۹۷۵ء میں مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے نائب صدر منتخب ہوئے، غالب اکاڈمی دہلی نے ان کو ۱۹۷۷ء کا اکاڈمی ایوارڈ دیا، اسی سال اتر پردیش اردو اکاڈمی نے

ان کے مجموعۂ کلام "بیاضِ مریم" پر تین ہزار کا انعام دیا، ان کی گوناگوں ادبی خدمات کی بنا پر انھیں ۱۹۸۱ء میں ترقی اردو بورڈ کا نائب صدر نامزد کیا گیا، وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے۔

جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، سروجنی نائیڈو، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، جعفر علی خاں اثر، قاضی عبدالغفار اور جگر مرادآبادی نے ان کی رعنائی خیال، حسن بیان اور ندرت فکر کی دل کھول کر داد دی، اور بہت جلد وہ اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہونے لگے، وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے، لیکن جب بھی کسی عظیم مشاعرہ میں کلام اپنے مخصوص انداز میں سناتے تو دلوں کے تار ہلا اٹھتے تھے، ان کے ترنم میں بلا کا سوز اور وجدانی کیفیت ہوتی، ان کی دو نظموں "ایلورا" اور "اجنتا" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ایلورا اور اجنتا ہندستانی بت تراشی اور مصوری کی حیرت انگیز یادگاریں ہیں، اسی طرح وجد صاحب کی ان پر لکھی ہوئی نظمیں بھی اردو شاعری میں خوبصورت اور قیمتی اضافہ ہیں، "اجنتا" ان بندوں سے شروع ہوتی ہے

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں　　جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں، رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی　　تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
متشکل ہے شبابِ حسن میں تخئیلِ انسانی　　تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

اسی طرح ان کی نظم "ایلورا" کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں — دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپا ہے نور ازل بت ہیں آستینوں میں — حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں
یہاں جو سیر کو فکر رسا نکلتی ہے
وفور شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

ان شاہکار نظموں کے علاوہ "تاج محل" "علی ساگر" "اورنگ آباد" "گہوارۂ مسیح" وغیرہ نظمیں بھی ان کی قوت مشاہدہ اور ان کی غیر معمولی فصاحت بیان کے نمونے ہیں۔

وہ سرکاری ملازم تھے، لیکن ابتدا ہی سے حب الوطنی اور آزادی کے جذبات سے سرشار تھے، اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں "کسان" اور "ترانۂ دکن" جیسی نظمیں لکھیں۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریک آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ کیا، اپنی نظم "آفتاب تازہ" میں وطن کی آزادی کا بڑے خوبصورت انداز میں خیر مقدم کیا ہے، "کاروان زندگی" بھی ان کی ایک بڑی اہم نظم ہے، جس میں انھوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساری دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور نہایت دلآویز انداز میں اقوام عالم کی آزادی کی بشارت دی ہے، ۱۹۴۲ء میں ان کی نظم "نیا گیت" اور "بشارت" خاص طور سے مرکز توجہ بن گئیں۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" ۱۹۴۴ء میں دوسرا "آفتاب تازہ" ۱۹۵۲ء میں تیسرا "اوراق مصور" ۱۹۶۳ء میں اور چوتھا "بیاض مریم" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئے، چوتھے مجموعۂ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وجد ہی کے لکھے ہوئے مسودے کا عکس لیکر مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے، ان کو نظم اور غزل دونوں اصناف سخن پر یکساں ماہرانہ قدرت حاصل تھی، نظموں میں اگر

فکر وفن کا حسین امتزاج، تنوع اور اثر انگیزی ملے گی تو غزلوں میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کی دلکشی اور تازگی پائی جاتی ہے،

وہ اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں، اورنگ آباد کے دو نامور غزلگو شاعر ولی اور سراج ہیں، ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ ؎

ڈیڑھ سو برس میں وجد، سراج و ولی کے بعد — اٹھے ہیں چھوتے ہوئے خاک دکن سے ہم

جو تغزل اور روحانی کیف ان قدیم غزلگو شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ وجد کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، بلکہ رنگ و آہنگ میں ان سے کہیں زیادہ لطافت اور شیرینی سے معمور ہے۔

مرحوم نہایت پرگو ہونے کے علاوہ باوقار، بلند نظر اور ہر دلعزیز انسان بھی تھے، تہذیب وشرافت، حسن اخلاق اور مشرقی وضعداری کے نمونہ تھے، جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کے شیوۂ گفتار ہی کے نہیں، بلکہ حسن کردار سے بھی متاثر ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں بیٹھ کر ادب اور شاعری کے نکات کے ساتھ فارسی شعرا کی نازک خیالیوں کے بہت سے گوشوں کی سیر ہو جاتی، وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے پوری طرح بہرہ ور تھے، اسلئے کبھی کبھی ان کی پاکیزہ ظرافت سے محفل احباب زعفران زار ہو جاتی، وہ دلِ درد آشنا بھی رکھتے تھے، اور دیدۂ بینا بھی، ان کے پاس زبانِ خوشنوا بھی تھی اور طرزِ دلربا بھی، ان کے اٹھ جانے سے اردو ادب کو عظیم نقصان پہنچا، اردو شاعری کی ایک دلکش آواز خاموش ہو گئی۔ ان ہی کا شعر ہے۔ ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے — جانے والوں کی یاد آتی ہے

وہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ارباب ذوق جب بھی ان کا کلام پڑھیں گے وہ برابر یاد آتے رہیں گے، وہ اردو کے ان شعرا میں تھے، جو اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، انکے کلام میں جو کیف ومستی، سوز وگداز اور بانکپن ہے، وہ دامنِ دل کو کھینچتے رہیں گے۔

ادبیات

غزل

از ڈاکٹر طفیل احمد مدنی - الٰہ آباد یونیورسٹی

وہ ذرۂ خاکی دست میں کونین سے بڑھ کر ہوتا ہے
قسمت سے ترے جلووں کا جسے فیضان میسر ہوتا ہے

یہ سرو وسمن، یہ لالہ وگل بھی زینتِ گلشن ہیں لیکن
گلشن میں ترے آجانے سے کچھ اور ہی منظر ہوتا ہے

کس دل سے کروں پیمانِ وفا اس شہرِ جفا میں میں آخر
پوشیدہ جہاں کے لوگوں کی آنکھوں میں بھی خنجر ہوتا ہے

یہ رسم نکالی ہے کیسی اے ہم نفسو! اے ہم عصرو
ہر جملہ تمھاری باتوں کا اک طنز کا پتھر ہوتا ہے

باطل کے مقابل اٹھنا بھی یونہی کوئی آساں کام نہیں
اور وہ تو بھلا کیا اٹھے گا جو ظلم کا خوگر ہوتا ہے

ساحل کی تمنا کرنا بھی توہین سمجھتا ہے اپنی
دریائے محبت کا اے دل جو اصل شناور ہوتا ہے

تنقید تو سب ہی کرتے ہیں حالات کو رکھ کر پیشِ نظر
شاعر کا مگر اس فن میں بھی کچھ اور ہی تیور ہوتا ہے

کیا اس کا کرے شکوہ کوئی قسمت ہے طفیل اپنی اپنی
اک ہاتھ میں ساغر ہوتا ہے ایک ہاتھ میں پتھر ہوتا ہے

مطبوعات جدیدہ

قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ سنہ ۱۹۱۴ء تک مرتبہ ڈاکٹر سید حمید شطاری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۵۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت: ۵۰ روپے، پتہ: محمد اکبر الدین صدیقی، چار قندیل آغا پورہ حیدرآباد

قرآن مجید مسلمانوں کا دستورِ حیات ہے، اس لئے ہر زمانہ میں اسے سمجھنے سمجھانے پر ان کی توجہ مرکوز رہی ہے، چنانچہ وہ جہاں گئے وہاں کی زبانوں میں بھی اسے منتقل کیا، تاکہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ بھی قرآن مجید کے احکام وتعلیمات سے واقف ہو جائیں، ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے اختلاط سے اردو زبان وجود میں آئی، تو اس میں بھی قرآن مجید کے متعدد ترجمے ہوئے اور تفسیریں لکھی گئیں۔ اس کتاب میں ابتدا سے سنہ ۱۹۱۴ء تک کے اردو ترجموں اور تفسیروں کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ دراصل لائق مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب کی حیثیت تمہید کی ہے، اس میں پہلے قرآن مجید کے ترجمہ کی ضرورت واضح کی ہے، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجموں کا مختصر خاکہ دیا ہے، پھر ترجمہ خصوصاً ترجمہ قرآن کی نزاکت اور دشواری کا ذکر کرکے اس کے چند مفید اصول بیان کئے ہیں، دوسرے باب میں قدیم دکنی دور کے پانچ ترجموں اور تفسیروں کا ذکر ہے، ان میں ایک سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ بھی ہے، تیسرے باب میں سنہ ۱۱۱۵ھ سے سنہ ۱۲۰۴ھ تک کی تفسیروں اور ترجموں کا تذکرہ ہے۔ اس میں پہلے دکن اور آخر میں شمال کی ترجمہ وتفسیر میں مساعی کا حال بیان ہوا ہے، چوتھے میں بھی دونوں علاقوں کے سنہ ۱۲۰۴ھ سے ۱۲۷۰ھ تک کے، اور پانچویں میں سنہ ۱۲۷۰ھ سے ۱۳۳۲ھ تک کے ترجموں اور تفسیروں کا جائزہ لیا ہے، اور ہر ایک کے

آخر میں منظوم ترجموں اور تفسیروں کا تذکرہ بھی ہے، ہر باب کے شروع میں پس منظر کے عنوان سے
اس عہد میں اردو کے ارتقاء کا ذکر بھی ہے، چند اہم ترجموں اور تفسیروں کے نام یہ ہیں: شاہ امداد
انصاری، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن، فورٹ ولیم کالج کا ترجمۂ قرآن مجید،
تفسیر حکیم محمد شریف خاں دہلوی، تفسیر مجددی (شاہ رؤف احمد) تفسیر چراغ ابدی یا چراغ ہمیشہ
(شاہ عزیز اللہ ہمرنگ اورنگ آبادی) تفسیر تنزیل (سید بابا قادری حیدرآبادی) تفسیر القرآن
(سید احمد خاں) تفسیر ترجمان القرآن بلطائف الرحمٰن (نواب صدیق حسن خاں) تفسیر حقانی (مولانا
عبدالحق حقانی) ترجمۃ القرآن (ڈپٹی نذیر احمد) تفسیر بیان القرآن (مولانا اشرف علی تھانوی)
قرآن عظیم ترجمۂ قرآن مجید (مولانا احمد رضا خاں) تفسیر قادری (مولانا سید شاہ محمد عمر حسینی)
منظوم ترجمۂ قرآن مجید (آغا شاعر قزلباش) وغیرہ کل ساٹھ ۶۰ ترجموں اور تفسیروں کا ذکر
ہے، جن میں ۴۶ مخطوطات ہیں، مصنف نے ترجمہ کی زبان، الفاظ، جملوں کے دروبست اور نحوی
ترکیبوں کا خاص طور پر جائزہ لیا ہے، اور دکھایا ہے کہ مترجم و مفسر نے قرآن کے مفہوم و منشا کو سمجھا
ہے یا نہیں، اور نہ سمجھنے کی وجہ خود اس کی کوتاہی اور موزوں و مناسب الفاظ کی تلاش میں ناکامی
ہے، یا اس عہد کی زبان و بیان کا عجز و قصور، دوسرے اور تیسرے باب میں جن ترجموں اور
تفسیروں کا ذکر ہے، ان کی زبان قدیم گجراتی اردو یا دکنی ہونے کی بنا پر عام فہم نہیں ہے، مصنف کو
اردو اور عربی کا اچھا ذوق ہے، اس لئے ترجموں کی زبان و بیان پر ان کے اکثر اعتراضات درست
ہیں، مثلاً فورٹ ولیم کالج کے ترجمۂ قرآن پر گفتگو کے ضمن میں "کَلَّا سَيَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ"
کے اس ترجمہ "حقا جلد جانیں پھر قسم ہے کہ جلد جانیں" کے متعلق لکھتے ہیں کہ دوسری مرتبہ حقا
کی جگہ اس کا ترجمہ قسم سے کیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں اس کا مفہوم قسم کا نہیں ہے، بلکہ ایک
طرح دھمکی اور تاکید ہے۔ سر سید احمد خاں نے حمد کا ترجمہ "بڑائیاں" کیا ہے، مصنف اسے

غیر موزوں بتاتے اور کہتے ہیں کہ بڑائی میں شیخی اور لاف زنی کا شائبہ بھی ہوتا ہے، مصنف کا دینی اور
قرآنی مطالعہ بھی اچھا ہے، چنانچہ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ
کی اس تفسیر پر جو سر سید نے کی ہے ان کا اعتراض بجا اور مناسب ہے (ص ۱۳۱ و ۱۳۲) مولوی
عبدالحق صاحب نے علما کی مخالفت ترجمۂ و تفسیر کی یہ وجہ تحریر کی ہے "یہ لوگ اپنے کو علوم دینیہ
کا خاص ماہر اور اسرار الٰہی کا وارث خیال کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ یہ باتیں عام ہو جائیں،
بعض اوقات اس لئے بھی مخالفت کی گئی کہ ترجمے اور تفسیریں ان کے منشا کے خلاف تھیں"۔ (ص ۲۵)
مصنف اس کی تردید کر کے بتاتے ہیں کہ "اندیشہ اس بات کا تھا کہ کہیں یہ ترجمے اور تفسیریں منشاء
و نحوائے قرآن کے خلاف نہ ہو جائیں" (ص ۳۰) زبان کی قدامت کے باوجود اردو کا کوئی ترجمہ شاہ
عبدالقادرؒ کے ترجمہ سے فائق نہیں سمجھا جاتا، مصنف کو اس میں تامل ہے، انہوں نے اس کے اور
شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمے کے کچھ نمونے مقابلۃً پیش کر کے دکھایا ہے کہ شاہ صاحب کے ترجمے میں موزوں
الفاظ کا انتخاب نہیں ہے، یا اس میں مفہوم کی کمی یا کمزوری ہے۔ جو شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ میں
نہیں ہے۔ حالانکہ اگر وہ اسی حیثیت سے شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کا بھی جائزہ لیں تو بعض جگہ شاہ
عبدالقادرؒ کے ترجمہ کے مقابلہ میں اس میں کمی نظر آئے گی، شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی خاص خوبی
ایجاز ہے، اس کے بارے میں "ایجاز کی دھن میں" کہنا سوء ادب بھی ہے، اور شائستگی تحریر کے
خلاف بھی، ان کی یہ رائے خلاف واقعہ اور غلط ہے کہ "شاہ رفیع الدین کے ترجمے سے انہیں
بعض مقامات پر مفہوم قرآن کی ادائی کے لئے اپنے ترجمہ کے عجز کا احساس ہوا اور اس کی تلافی کیلئے
حاشیہ لکھنا شروع کیا جو بعد میں موضح قرآن کے نام سے مشہور ہوا" (ص ۱۷۸) کیونکہ اولاً تو یہ
بلا ثبوت و دلیل ہے، موضح قرآن کے مقدمہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ دوسرے خود مصنف
کا بیان ہے کہ ان کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا، اور اسی سال انہوں نے موضح کی تحریر کا کام بھی

شروع کر دیا تھا، جبکہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ کئی سال بعد بلکہ ۱۲۲۲ھ میں لکھا گیا، ایسی صورت میں
وہ موضح قرآن میں اس سے استفادہ کس طرح کر سکتے تھے، کسی مصنف کے عقیدہ و مسلک کو اس کی
کتاب پر اثر انداز نہیں ہونا چاہئے، مگر مصنف اس سلسلہ میں توازن اور غیر جانبداری قائم نہیں رکھ
سکے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ پر طعن و تشنیع کی ہے
اور مولانا تھانوی پر بعض بیجا اعتراض بھی کئے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں مولانا احمد رضا خاں کے غلط
ترجمے کی بھی تحسین کی ہے۔ مثلاً انہوں نے نبی کے معنی غیب کی خبریں بتانے والے (نبی)، شاہد کے
حاضر و ناظر" ولا تقطع "کے خوشی نہ کرو اور درخ کے درگذر فرما لکھا ہے، اور مصنف نے اس کو
سراہا ہے، اس کتاب میں جن مخطوطات کا ذکر ہے، ان میں سے اکثر دکن کے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ انہیں
شمالی ہند کے مخطوطات کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ زبان و بیان کی خامیاں بھی ہیں، جیسے لیکن مفہوم کی
ادائی میں نہ صرف گنجلک پیدا ہوا (ص۹)، جن کی زبان و بیان میں بڑا ثقل اور گنجلک ہے (ص۴۵) خیر کم
من تعلم القرآن و علمہ کے احکام میں مسلمانوں نے سر دھرے ہیں.. (ص۲) مگر ایجاز کی دھن میں
موزوں و مناسب الفاظ کا انتخاب نہ کر پایا، موزوں الفاظ کو چھوڑتے تو ایجاز کا دامن ہاتھ سے نکل جاتا
(ص۱۴۳)، بعض جگہ تعارف کرواتے، گمنام و نشان، متن نافہمی، محتاط نظری جیسے نامانوس
الفاظ لکھے ہیں۔ مندرجہ ذیل جملے میں توالی اضافات ہے "یہ (قرآن) جامع خصوصیات صحائف سابقہ
ہے (ص۲۰)" لیکن ان فروگذاشتوں سے کتاب کی خوبی میں فرق نہیں آتا، یہ بڑی محنت و کاوش کا
نتیجہ اور قابل قدر ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ شخصیت اور فن — مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۲۴ مجلد، قیمت ۳۵ روپئے

پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اولیائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے، ان کے اقوال
و ملفوظات تصوف کی ہر کتاب کی زینت ہیں، مگر ابھی تک اردو میں ان پر کوئی مستقل کتاب نہیں
لکھی گئی تھی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کو ان کی ذات سے والہانہ شغف رہا ہے، اس لئے انہوں
نے ان کے حالات، کمالات، ارشادات اور تعلیمات کا یہ مجموعہ بڑی عقیدت اور نہایت شوق
سے قلمبند کیا ہے، اسکا پہلا باب ان کے حالات و سوانح کے لئے خاص ہے، اس میں روایتی انداز
سے ہٹ کر ان کے حالات کے بارہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت دلآویز
اور پُر اثر ہے، دوسرے باب میں ان کے نظریۂ تصوف کی وضاحت کی ہے۔ اسکا لب لباب یہ ہے
کہ ان کے تصوف کا کتاب و سنت سے گہرا رشتہ ہے، اور اس کی بنیاد قرآن کی تعلیمات، احادیث
نبویؐ، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی پاک سیرت پر ہے، تیسرے باب میں ان کی دلکش شخصیت
کے خط و خال نمایاں کئے ہیں۔ اس میں ان کی خلوت، خاموشی، سلامت روی، محتاط رویہ، اعتدال،
توازن اور دوست نوازی وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اکثر صوفیہ پر شطحیات کی وجہ سے
جو الزام لگائے جاتے ہیں، ان کا حضرت جنیدؒ کے یہاں کوئی امکان نہیں، کیونکہ وہ سکر پر صحو کی
بالادستی کے قائل تھے، جو ان کے کمال روحانیت کی دلیل ہے، حضرت جنیدؒ کی شخصیت کے خط و
خال کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لئے چوتھے باب میں ان کے اساتذہ اور رفقا کا تذکرہ بھی ہے، جو
ان کے عہد کے بغداد کے نامور صوفی تھے، مصنف کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہاں تصوف کے
۲ مکتب فکر خاص طور پر مشہور تھے، ایک خود بغداد کا مدرسۂ تصوف، دوسرا نیشاپور کا، حضرت
جنیدؒ دونوں مکتب فکر میں مقبول تھے، ساتویں باب میں بھی ان کی جانب منسوب کتاب "معانی الہم"
میں مذکور علمائے صلحا کا مختصر خاکہ قلمبند کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت جنیدؒ کے زمانہ میں
آسمان تصوف پر کیسے کیسے مہر و ماہ جلوہ فگن تھے، پانچویں باب میں نظریۂ توحید پر کچھ دلچسپ اور

لطیف بحث کی گئی ہے، جو بغداد کے صوفیوں اور خود حضرت جنیدؒ کا خاص موضوع فکر تھا، چھٹے باب میں حضرت جنیدؒ کی عام کتابوں اور رسالوں کی فہرست درج ہے، اور معالی الہمم پر مبسوط تبصرہ کرکے اس کی قدر و قیمت واضح کی گئی ہے، اور اس کے حضرت جنیدؒ کی تصنیف ہونے نہ ہونے کے متعلق لوگوں کی رائیں نقل کرکے مصنف نے ان لوگوں کی تائید کی ہے جو اسے ان کی تصنیف نہیں مانتے، آٹھویں باب میں معالی الہمم کا شگفتہ اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مولوی شفیق احمد خاں ندوی لکچرر عربی زبان و ادب کے قلم سے ہے۔ مصنف کو تسلیم ہے کہ یہ حضرت جنیدؒ کی تصنیف نہیں ہے، مگر اس کی افادیت، صوفی ادبیات میں اہمیت اور تصوف کے بنیادی فکر کے ترجمان ہونے کی بنا پر اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں حضرت جنیدؒ کے افکار و خیالات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، ترجمہ سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے، یہ ترجمہ دس ابواب پر مشتمل اور تصوف و معرفت کا خزینہ ہے، باطن کی طرح اس کتاب کا ظاہر بھی پرکشش اور دیدہ زیب ہے، مگر دو ایک جگہ املا اور کتابت کی غلطی بھی ہے، جیسے "سنن لنسئی" ص ۱۳۲، صحیح سنن نسائی ہے۔

خطوط غالب فنی تجزیہ:- مرتبہ جناب حامدہ مسعود صاحبہ، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۶۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

مرزا غالب کو اپنی فارسی شاعری کی طرح فارسی نثر نگاری اور خطوط نویسی پر بھی فخر تھا، اور وہ اردو شاعری کی طرح اردو میں نثر نگاری و خطوط نویسی کو بھی اپنی شان سے فروتر سمجھتے تھے، مگر ان کی اردو شاعری کی طرح ان کے اردو خطوط بھی نہایت بلند پایہ اور ادب عالی و انشائے لطیف کا نمونہ ہیں، جن سے اردو میں سادگی، اصلیت اور سلاست نگاری کا آغاز ہوا، مگر شاعری کے مقابلہ میں ان کی جانب کم اعتنا کیا گیا ہے، یہ غالباً اس موضوع پر ایک باقاعدہ

کتاب کا اضافہ ہوا ہے، جس میں نہایت دقت نظر سے غالب کے خطوط کا مطالعہ و تجزیہ کرکے ان کے اہم اور قابل ذکر پہلوؤں اور نمایاں خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے، غالب نے خطوط قلم برداشتہ لکھے ہیں، اس لئے ان میں بڑی بے تکلفی اور سرا سر آمد ہے، علاوہ ازیں انہوں نے ان میں اپنے روز مرہ کے معمولات، صبح سے شام تک کے مشاغل، نشست و برخاست، لوگوں سے ملنے جلنے، دوست واحباب سے ملاقات کا حال، کھانے پینے کی چیزوں، لباس، موسم اور اردگرد کے لوگوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے بارہ میں اظہار خیال کیا ہے، جن سے ان کی طبیعت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں ہوتے ہیں، اور ان سے تحریر کی برجستگی و بے ساختگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، نیز یہ غالب کے عالی دل و دماغ کی کد و کاوش کا نتیجہ ہیں، ان میں طنز، ظرافت، شوخی، خوش طبعی، بذلہ سنجی، زبان دانی، آپ بیتی اور جگ بیتی بھی آگئی ہے، اس لئے ان خطوط میں سادگی و اصلیت، واقعیت و حقیقت نگاری کے ساتھ پرکاری و دلآویزی بھی ہے، اور ان سے ان کے اسلوب و طرز بیان کی خصوصیات بھی معلوم ہوتی ہیں، اس کتاب کی لائق مرتبہ نے ان خطوط کا مکمل تجزیہ کرکے ان سب خوبیوں اور دوسرے فنی و ادبی محاسن پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے، اور آخر میں منتخب خطوط کے نمونے بھی اس میں شامل کردیئے ہیں، جن سے اس کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے، یہ کتاب غالبیات میں ایک اچھا اضافہ ہے، اس کے لئے مصنفہ داد و تحسین اور غالب کے قدر دانوں کے شکریے کی مستحق ہیں، ان کی تحریر سے بھی ان کی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی ہے، غالب کے خطوط کی جن خوبیوں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے اور جن کو مختلف عنوانات کے تحت فہرست میں علیحدہ علیحدہ درج کیا ہے، اگر وہ کتاب کے اندر بھی یہ عنوانات قائم کردیتیں تو پڑھنے والوں کو مزید سہولت ہوتی، کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں جیسے ان کی والد (ص ۱۱۱) اساتذہ فن (ص ۱۱۳) بجائے اساتذہ فن، منقع (ص ۱۳۶) بجائے منقّٰی، اور مذاحاً (ص ۱۳۷) بجائے مزاحاً وغیرہ،

انتخاب مستقل: مرتبہ جناب محمد حامد علی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۰۸، قیمت چار روپے، پتہ: اترپردیش اردو اکیڈمی، بلیرہ ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ۔

مولانا حسرت موہانی طرفہ تماشا طبیعت کے مالک تھے، ان کے یہاں علم و ادب اور شعر و سخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آتا ہے، انہوں نے اردوئے معلی اور تذکرۃ الشعراء کے علاوہ ایک سیاسی اخبار بھی "مستقل" کے نام سے نکالا تھا، جس کے فائل اب کمیاب ہیں، حسن اتفاق سے اس کے اکثر پرانے شمارے ایک صاحب ذوق رئیس اور آل انڈیا حسرت اکیڈمی گورکھپور کے صدر جناب حامد علی صاحب کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھے، جس کے اداریوں کا یہ انتخاب انہوں نے اترپردیش اردو اکیڈمی کے لائق چیرمین ڈاکٹر محمود الٰہی کی فرمائش پر کیا اور اکیڈمی نے اسے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ ان اداریوں میں گذشتہ نصف صدی قبل کے اہم قومی، ملی اور سیاسی واقعات و مسائل پر حسرت نے بے لاگ اظہار خیال کیا ہے۔ ان سے ان کی طبیعت کے خاص رنگ کا بھی پتہ چلتا ہے، اور ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی بھی ہوتی ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں حسرت کی صحافت اور "مستقل" کے متعلق مفید اور ضروری معلومات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور ان کے مضامین اور اداریوں کی خصوصیات پر بھی مناسب انداز سے بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس انتخاب کی حیثیت ایک سیاسی دستاویز کی ہے جس کی اشاعت پر لائق مرتب اور اترپردیش اردو اکیڈمی دونوں تحسین کے مستحق ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے "اوائل ۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ منتقل ہونے پر..." (ص ۱۲) یہ سہو قلم ہے، وہ تو اس سال علی گڑھ کو خیرباد کہکر کانپور منتقل ہوئے تھے۔

بچے اور اسلام: از مولانا سید جلال الدین صاحب انصر عمری، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ: مرکزی مکتبۂ اسلامی، دہلی ۶۔

۱۹۷۹ء میں اقوام متحدہ کی تحریک پر پوری دنیا میں بچوں کا سال منایا گیا تھا، یہ کتابچہ اسی موقع کیلئے لکھا گیا تھا، جسمیں بچوں کے بارہ میں ضروری اسلامی تعلیمات درج ہیں جیسے قتل اولاد کی ممانعت، عقیقہ، اذان اقامت، پرورش، تعلیم و تربیت نیز یتیم اور

جلد ۱۳۲ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۳ء عدد ۲

مضامین